از

ابو ظفر عبد الواحد ایم۔ اے و محمد عطاء الرحمن بی۔ اے

(اساتذہ شعبۂ کلیہ)

سٹی کالج۔ حیدرآباد دکن

مطبوعہ

شمس المطابع نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

طبع اول ۱۹۳۶ء باتعداد صرف ریاست کیلئے ۳ م سے

فہرست مضامین

پیش لفظ:- جناب سید محمد اعظم صاحب ایم۔اے (کیمبرج)
بی ایس سی (ڈبلن) پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد دکن

فہرست تصاویر

عنوان تصویر	محاذی صفحہ
(۱) قدیم مصری تحریر	سرورق
(۲) ابتدائے زندگی	۱۳
(۳) نیانڈر تھالی انسان	۲۳
(۴) قدیم عصر الحجری انسان	۲۶
(۵) جدید عصر الحجری انسان	۳۰
(۶) ایک قدیم ہندی حمام	۵۰
(۷) ایک مصری جنازہ	۷۰
(۸) مصری معبد کے ہال کا ایک حصہ	۸۵
(۹) سامری معبد	۸۶
(۱۰) ایک اور سامری معبد	۸۷
(۱۱) قدیم قرطبی بادشاہوں کی تخت گاہ	۱۱۷
(۱۲) ایک اشوری معبد کا ہال	۲۰۰
(۱۳) عبرانی مقدس	۲۰۸

پیش لفظ

میں بڑی مسرت کے ساتھ اپنے کالج کے دو لائق اساتذہ، یعنی مولوی ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم۔اے اور مولوی عطاء الرحمٰن صاحب بی۔اے، کی متحدہ تالیف "تمدن عتیق" کے لئے محض ان کے پیہم اور مسلسل اصرار پر یہ مختصر سا پیش لفظ لکھ رہا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قابل مولفین نے میرے ذمہ یہ فرض عاید کرتے ہوئے اپنے خلوص و محبت کی وجہ سے میری نسبت بہت زیادہ حسنِ ظن سے کام لیا ہے کیونکہ مجھے

بخوبی اس کا علم ہے کہ میں اس کام کے لئے خاطرخواہ موزوں نہیں ہوں۔ میں کبھی حقیقی معنوں میں تاریخ کا متعلم نہیں رہا۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ تاریخ بنی نوع انسان اور خصوصاً تاریخ تمدن کے محرکات اور ان کے اسباب و علل کا مطالعہ میرے لئے ہمیشہ دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔ اس خود ستائی کی معذرت کرتے ہوئے میں محض ایک غیر فنی اور عامی آدمی کی طرح اس دشوار گزار وادی میں، جہاں ماہرین فن بھی ڈرتے ڈرتے بڑھتے ہیں، قدم رکھتا ہوں۔

مجھے اس امر کی بہت زیادہ خوشی ہے کہ میرے عزیز دوستوں نے اس اچھوتے اور دلکش موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھایا ہے اور اردو میں اس موضوع کے تمام مولفین پر انھیں اولیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ان کی

یہ تالیف ہر آئینہ اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے مجھے اُمید ہے کہ یہ سعی مستحسن نہ صرف بجا سے خود پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی بلکہ اِس قبیل کے موضوعات پر ان کے نیز دوسرے قابل اصحاب فکر کے قلم سے مزید تالیفات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

میں انھیں مخلصانہ طور پر یہ مشورہ دوں گا کہ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ اس کام کو، جس کا انھوں نے بڑی ہمت اور مستعدی سے بیڑا اُٹھایا ہے، پایۂ تکمیل کو پہنچائیں اور تاریخ عالم کے موضوع پر بھی ایک کتاب تالیف کریں۔ اردو میں اس قسم کی عمدہ کتابوں کی جس قدر شدید ضرورت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ وہ اپنے وسیع مطالعہ، گہری نظر اور موجودہ رجحانات و تحریکات سے واقفیت کے لحاظ سے اس کام کے

لئے خاص طور پر موزوں ہیں۔

خود اس کتاب کے بارے میں مجھے اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ مولفین نے باہمی اشتراک عمل سے اس مشکل کام کو غیر معمولی کامیابی اور خوش سلیقگی کے ساتھ انجام دیا ہے اور غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے واقعات و حالات کے ایک ذخیرۂ کثیر کو بڑی خوش اسلوبی سے اس چھوٹی سی کتاب میں سمو دیا ہے۔

معاشرہ و تمدن کے ارتقا کے مسائل ہمیشہ سے علمائے انسیات و نسلیات کے لئے بہت ہی دل کش اور جاذب توجہ رہے ہیں۔ جب انسان پہلے پہل اس دُنیا میں نمودار ہوا اس وقت کے

معاشری اور تمدنی حالات کیا تھے؟ کس طرح اس نے تہذیب و تمدن میں درجہ بدرجہ ترقی کی؟ کیا اس کے مدارج وجہات ترقی ہمیشہ اور ہر جگہ یکساں رہے ہیں؟ ان سوالات کے متعلق فلسفیوں، مذہبی پیشواؤں، شاعروں اور رشیوں وغیرہ نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ ذاتی یا موقتی عقاید، توہمات اور تخیلات پر مبنی ہیں جن کی عہد حاضر میں عقلی دلائل سے توجیہہ نہایت ہی دشوار بلکہ نا ممکن تھی۔ واقعات اور حقائق ایک مسئلہ لاینحل بنے ہوئے تھے اور اس خصوص میں علم انسانی کی بے لسبی بہت ہی افسوسناک تھی۔

سائنس کی اعانت کے بغیر یہ قدیم و فرسودہ خیالات جو صدیوں سے انسانی دل و دماغ پر

مستولی تھے اور اس کو ایک خارجی اور مافوق الفطرت چیز کے آگے سر عجز و نیاز خم کرنے کی ہدایت کرتے رہے، کسی طرح رفع نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اب سے دو تین نسل پہلے کا ذکر ہے کہ سائنس نے اس طرف پیش قدمی کی اور اس بارے میں جو قدیم خیالات اور سینہ بہ سینہ روایات تھے، ان کو نظر انداز کرکے بالکل منطقی اور تحقیقاتی اصول پر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش شروع کی۔ مواد متعلقہ کی فراہمی اور جزئیات و فروعات کی کامل چھان بین اور مختلف چیزوں کے باہمی مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنے نتائج تحقیق کو مسلمہ اصولوں کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے اس نے تاریخ تمدن کے لئے نہ صرف ایک عظیم الشان ماضی کا پتہ چلایا بلکہ اس کے

حدود کو بھی واضح طور پر متعین کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ معاشرے کے نقطۂ آغاز کو بے نقاب کرنے میں اس کو پورے طور پر کامیابی نہ ہوئی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی تحقیقات نے ان مختلف مدارج اور گوناگوں حالات کا انکشاف کر دیا ہے، جن سے نسل انسانی کی اکثر شاخیں گزر چکی ہیں۔ اس لئے یہ چیز بھی تیقن کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ اگر کبھی معاشرے کی اصل اور آغاز کا صحیح پتہ لگایا جاسکتا ہے، تو ان ہی حقائق اور واقعات کی چھان بین کے ذریعہ سے۔ سائنس کے تمام نظریوں اور نتائج تحقیق کی طرح اس بارے میں بھی اس کے مستخرجات ایک طرح سے عارضی ہیں۔ مزید تحقیق، توسیع معلومات، غائر مطالعہ اور بحث و تمحیص کی روشنی میں ہر طرح ردّ و بدل

کا امکان ہے۔ باوجود اس کے اس میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ سائنس کی تحقیقات کھلی شہادتوں اور غیر مختتم حقیقتوں پر مبنی ہے اور اسی لئے بہ حیثیت مجموعی نہایت مستحکم ہے۔ اس سے انکار کرنا یا اس کی تردید کرنا آسان نہیں۔

آیندہ صفحات میں فاضل مولفین نے تواریخ اور سنین کی اعانت کے بغیر ارتقاء تمدن کے مدارج کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی طرز نگارش نہایت سلجھی ہوئی اور شُستہ ہے۔ روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ پیرایۂ بیان کی متانت و سنجیدگی قابل تعریف ہے۔ میں اس کامیاب کوشش پر اپنے دوستوں کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔

سید محمد اعظم

باب پہلا

آغازِ گیتی

اُن قدیم تمدنوں سے جو تخمیناً آٹھ ہزار سال قبل منظرِ ہستی پر رو نما ہوئے، ہمیں داستانِ تمدن کے اِن اوراق کی ابتدا کرنا زیادہ آسان تھی۔ لیکن ہم اگر ایسا کرتے تو اندیشہ تھا کہ پڑھنے والوں کے ذہن پر بالکل غلط نقوش مرتسم ہوتے۔ وہ غالباً یہ تصور کرتے کہ انسانی تمدن نے کسی خاص دَور میں یکایک جنم لیا۔ حالانکہ کسی تمدن کے جنم کا جب کبھی ہم ذکر کرتے ہیں تو محض اُستعارتاً اس طرح کہتے اور کسی خاص دَور کی طرف اشارہ کرتے

ہیں جس میں بنی نوع انسان ذہنی، روحانی، اور
مادّی حیثیت سے ترقی کی ایک معین سطح پر پہنچ
جاتے ہیں - یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ارتقائی عمل وجودِ
انسانی کے ساتھ شروع ہوا، اور جب تک انسان
زندہ ہے، یہ سلسلہ برابر اسی طرح جاری رہے گا
ایک اور امر ہے جو کبھی نظر انداز نہ کرنا
چاہیئے - وہ یہ کہ تمدن ایک مسلسل اور غیر منقطع
عمل کا نام ہے اور وہ ازمنۂ ماضیہ سے تا
حال ایک درخت کی طرح پھلتا، پھیلتا اور
بڑھتا رہا ہے - اس لئے جب کبھی تمدنہائے
عتیق کا ہم ذکر کرتے ہیں تو کسی خاص تمدن
یا تمدنوں سے جو ایک زمانے تک اپنی تابناکی
دکھا کر نظروں سے غائب ہو گئے، مطلق ہماری

مراد نہیں ہے ، بلکہ ان تمدنی مظاہرات سے
ہمارا حقیقی مدعا تمدنِ انسانی ہے جو مختلف
ازمنۂ ماضیہ میں نشو و نما پاتا رہا۔

تمدن ہائے عتیق کی داستان سے اس
کتاب کی ابتدا نہ کرنے کا ایک اور سبب
ہمارے پاس یہ ہے کہ اس قسم کے آغاز سے
پڑھنے والوں کے ذہنوں میں انسانی تمدن کی
قدامت ، اور بساطِ ہستی پر انسانوں کی کامرانی
کا ایک غلط تصوّر قائم ہوتا ۔ اس کے برخلاف
ہمیں یہ دکھانا ہے کہ زمین کی دیرینہ روزی کے
آگے انسانی تمدن کی عمر کسی حساب میں نہیں
اور نسلِ انسانی کی نام نہاد کامرانیاں فطرت
کی فیروز مندی کے سامنے پریدہ رنگ نظر

آتی ہیں۔

اب ہم ان اوراق کے پڑھنے والوں کے سامنے ایک ایسا منظر پیش کریں گے جبکہ سیارہ زمین پر آثار حیات کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم اُن سے ایک ایسے زمانے کا تصوّر کرنے کی درخواست کریں گے جبکہ ہماری زمین، ہمارا نظام شمسی، یا کسی نظام شمسی یا ستارہ کا وجود نہ تھا۔

سائنس دانوں کا بیان ہے کہ ہزاروں کھرب سال قبل جس کے تعقل سے ذہن انسانی عاجز آجاتا ہے، چاروں طرف صرف ایک فضائے بیکراں تھی جس میں مافوق الادراک جسامت کے بخاراتی سحاب گردش کر رہے تھے۔ ایک زمانے کے بعد

یہ بخاراتی سحاب مکثف ہوکر جسیم ستاروں کی شکل میں رو نما ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسے کوئی ڈیڑھ ارب ستارے معرض وجود میں آئے، اور اس قبیل کا پہلا ستارہ اب سے کوئی دو ہزار کھرب سال پہلے صورت پذیر ہوا تھا۔ ان ستاروں کے مقابلے میں ہمارا سورج بچہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ سورج بخاراتی حالت سے ستارے کی شکل میں اب سے صرف ستّر کھرب سال پہلے منتقل ہوا ہے۔ اُس وقت آفتاب کی جسامت اور اُس کی حرارت بہت زیادہ تھی، اور موجودہ رفتار سے کئی گُنی تیزی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اس گردش میں چند دہکتے ہوئے ٹکڑے جرم آفتاب سے کوئی دو ارب سال قبل جدا ہوکر سیارے بنے جن میں سے ایک ٹکڑا

ہماری زمین ہے۔ سیارۂ زمین سے پھر ایک ٹکڑا علیحدہ ہوکر چاند بنا۔

پہلے پہل زمین بھی آفتاب کی طرح ایک دہکتا ہوا گولا تھی۔ اس کی سطح پر کھولتا ہوا چٹانی مادّہ جوش مارتا تھا، اور اُس کے اطراف کی فضا یا کرۂ ہوائی میں آبی، گندھکی، اور دھاتی بخارات کی طوفان خیز ہوائیں چلتی تھیں۔

اس کے بعد زمین بہ تدریج سرد ہونے لگی۔ لاکھوں برس اس طور پر گزرنے کے بعد اطراف کی فضا بھی سرد ہونا شروع ہوئی جس کے باعث آبی بخار مکثّف ہوکر مینہ کی شکل میں برسنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ زمین کی بیرونی سطح بھی منجمد ہوتی گئی۔ بعض مقامات پر یہ منجمد مادّہ نچلی سطح کے

نیم رقیق مادّے میں ڈوبتا گیا اور اُس کی جگہ دوسرا نیم رقیق مادّہ لے کر منجمد ہوتا گیا۔ اس طرح یہ سلسلہ بھی لاکھوں برس تک جاری رہا اور طوفانی بارشوں کے عمل سے زمین کی سطح پر گرم پانی کی نہریں بہنے لگیں۔ پھر یہ گرم پانی جلد جلد تبخیر ہو کر بارش کی شکل میں مدتوں برستا رہا اور اپنے ساتھ بے شمار حل پذیر مادّے اور نا حل پذیر ریت کو بہا لیتا گیا جس سے زمین کی سطح پر نشیب و فراز پیدا ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ نشیبوں میں پانی جمع ہو کر تالاب اور تالابوں سے سمندر بننے لگے۔ پایانِ کار زمین سرد ہوتے ہوتے تقریباً موجودہ حالت پر پہنچ گئی جس کے بعد اُس کی سطح پر قیامِ زندگی کا امکان پیدا ہوا۔

اب تک ہمیں یہ خبر نہیں کہ زمین کے علاوہ اور سیاروں پر بھی آثار حیات پائے جاتے ہیں یا نہیں ۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ خود زمین پر جبکہ وہ آفتاب سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی، تقریباً ایک ارب سال تک جان دار مخلوق کا وجود بالکل مفقود تھا ۔
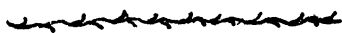
باب دوسرا

کرشمۂ حیات

ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ آفتاب سے جدا ہونے کے ایک ارب سال تک سیارۂ زمین پر زندگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ لیکن آج نہ صرف ہمارے گرد و پیش بلکہ سطح زمین سے پانچ میل کی بلندی اور زمین کے نیچے کوئی تین میل کی گہرائی تک زندگی کی گرم بازاری نظر آتی ہے۔ زندگی کی ابتدا ایک نہایت پُر اسرار واقعہ ہے۔ لیکن جس طرح ہمیں ایک اور پُر اسرار واقعے یعنی آفرینشِ زمین کے متعلق سائنس دانوں کے بیان کو ماننا پڑتا ہے،

اُسی طرح زندگی کی ابتدا کے بارے میں بھی سائنس دانوں کے بیان کو تسلیم کرنے پر ہم خود کو مجبور پاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زندگی کی ابتدا اوّل اوّل پانی کے اُتھلے گڑھوں میں چھوٹے چھوٹے آبی پودوں اور کیڑوں سے ہوئی۔ بعد ازاں جسیم دریائی عقرب یا جل بچھو وغیرہ وجود میں آئے۔ اس کے بعد مچھلیاں پیدا ہوئیں۔

مختصر یہ کہ جیسے جیسے لاکھوں برس کا زمانہ یکے بعد دیگرے گزرتا گیا، کروروں انواع روے زمین پر نمودار ہوئیں۔ اور ایک عرصۂ دراز تک افزائش نسل کرنے کے بعد، اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر فنا ہوگئیں۔ اس زمانے میں عظیم موسمی تغیرات ہوا کرتے تھے، اور گرم و معتدل حالت فوراً شدید سردی اور برف باری

سے بدل جاتی تھی۔ لہذا زندگی کے ان دشوار گزار راستوں کو وہی انواع طے کر سکیں، جن کے پاس نا موافق حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی سازوسامان موجود تھا۔ بعض صورتوں میں حسنِ اتفاق نے بھی اُن کی یاوری کی۔ لیکن عام طور پر جو انواع کمزور تھیں وہ ان سختیوں کی تاب نہ لاکر صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئیں۔ لیکن جب شدید موسمی تغیرات کسی قدر مدہم اور بہ دیر رو نما ہونے لگے، تو بعض انواع نے خود کو جدید حالات کے موافق بنا کر اپنی زندگی کو متغیر شکل میں برقرار رکھا۔ غرضکہ اس اصول توافق کے تحت جب نباتات اور حیوانات لاکھوں برس تک پانی میں گزارنے کے بعد خشکی کی طرف بڑھنے لگے، تو اُن کے جسم پر دبیز جلد یا کھال نمودار ہوگئی

جس نے آفتاب کی تمازت سے اُنھیں مصئون رکھا لیکن جس طرح پودے جان دار عضویوں سے پیشتر پانی میں پیدا ہوئے تھے، اسی طرح زمین پر بھی اُن کی افزائش عضویوں سے پہلے شروع ہوئی۔

رفتہ رفتہ زمین پر مختلف قسم کے دلدلی پودوں تناور درختوں، اور نباتات کی افزائش ہونے لگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مختلف قسم کے جسیم شہ کھیکڑے اور آبی عقرب آہستہ آہستہ زمین کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے پر والے جھینگر گھونگے، کچھوے اور مینڈک بھی پیدا ہوئے۔

اگرچہ زندگی سطح زمین پر پھیلنا شروع ہو گئی تھی، لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ افزائش انواع پانی سے دور ہوا کرتی تھی، اس لئے کہ ابتدا

پہلی زندگی دلدلوں اور نواحِ ساحل کی مرطوب زمین پر پائی جاتی تھی

میں نباتات و حیوانات دونوں آب خاکی، یا نیم آبی تھے۔ پودے پانی میں اُگتے تھے، اور حیوانات پانی میں انڈے دیا کرتے تھے۔ لہذا پہلے پہل زندگی دلدلوں اور نواح ساحل کی مرطوب زمین پر پائی جاتی تھی۔ ابھی تک پہاڑوں اور ٹیلوں پر زندگی کی نیرنگیوں کا نام و نشان نہ تھا۔

نباتات کی کثرت افزائش کا زمانہ گزرنے کے بعد سخت سردی و خشک سالی کا دَور شروع ہوا۔ اور اس کے بعد پھر معتدل حرارت کا زمانہ آیا جس میں پودوں نے خشکی کے حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرلی۔ اس زمانے میں ایک قسم کے تاڑ نما درخت اُگنے لگے۔ لیکن ابھی تک پھول دار درخت وجود میں نہیں آئے تھے، اور نہ زندگی پہاڑوں تک

پہنچی تھی - اِسی زمانے میں جسیم لیکن کمزور پا زحافہ (Reptiles) بہ کثرت رونما ہوئے، اور یہ خالصتہً خشکی کے جانور تھے - ان کے علاوہ چھپکلیاں، گھڑیال سنگ پشت، اور سانپ بھی پائے جاتے تھے - بعض زحافوں کے جسم پر، پر بھی پھوٹنے لگے اور جب ان سے رفتہ رفتہ پنکھ یا بازو تیار ہو گئے تو زحافوں نے پرندوں کی شکل اختیار کر لی - اسی زمانے میں بعض پستانیاں بھی موجود تھے جن کے جسم پہ بال ہوا کرتے تھے لیکن یہ نسبتاً کم جسامت والے جانور تھے -

اس معتدل زمانے کے بعد سطح زمین پر ایک شدید طوفانی تغیر رونما ہوا جس میں زحافوں کی مختلف انواع تباہ ہو گئیں - خیال کیا جاتا ہے کہ یہ طوفان اب سے ۴ تا ۸ کرور سال پہلے آیا تھا، اور یہ کہ

زمین کا موجودہ نقشہ اسی طوفان کے بعد قائم ہوا۔

اس طوفان کی تباہ کاریوں میں سے بچ کر نکلنے والے حیوانوں میں کچھوے، گھڑیال، سنگ پشت، پرندوں اور پستانیوں کا شمار ہوتا ہے۔ اب پرندوں اور پستانیوں کی نسل کی تیزی سے افزائش ہونے لگی۔ اسی زمانے میں مختلف انواع کے درخت بھی وجود میں آئے، اور مکھیوں اور تیتریوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی بھی نشو و نما شروع ہوئی۔

پرندے اور پستانیاں اعلیٰ عصبی نظام اور تحفظِ نسل کے میلان کے علاوہ، ایک بالکل نئی چیز یعنی اجتماعی زندگی اپنے ساتھ لائے۔ لہذا اس زمانے کو جو پرندوں، پستانیوں، اور پھولوں کا زمانہ کہلاتا ہے، دماغی نشو و نما کا دور کہنا بے جا نہ ہوگا۔ گھوڑے، اونٹ

ہاتھی، سور، کتے، بلی، زرافہ، ہرن، شیر، ببر اور نیم انسانی خصوصیات رکھنے والے بن مانسوں کے اجداد (جن کی اس زمانے میں کثرت سے افزائش ہو رہی تھی) سب کے سب دماغ رکھنے والے حیوان تھے، اگرچہ اُن کے دماغ یا بھیجوں کی جسامت موجودہ انواع کے بھیجوں سے بہت کم تھی۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا جس میں زمین سکڑنا شروع ہوئی، اور آتش فشانی زلزلے رونما ہونے لگے۔ یہی زمانہ ہے جبکہ کوہ ہمالیہ اور آلپس وجود میں آئے۔ اس کے بعد چار عظیم برفیلے زمانے آئے۔ پہلا چھ لاکھ سال قبل آیا تھا، اور چوتھا پچاس ہزار سال قبل شدّت کے عروج کو پہنچا۔ اسی عالمگیر سرما کی برف میں چند لاکھ سال پہلے اولین انسان نما مخلوق صفحۂ

ہستی پر نمودار ہوئی۔ ہمیں اُن کے وجود کا پتہ اُن کے استخوانی باقیات سے نہیں، بلکہ اُن کے تیار کردہ آلات و اوزار سے ملتا ہے۔ اس زمانے کے دفینوں سے ایسی چیپیں اور پتھر بھی برآمد ہوئے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ہاتھ رکھنے والی مخلوق نے ٹھوکنے، چھیلنے یا لڑائی کا کام لینے کی غرض سے ان کو تراشا تھا۔ چنانچہ کوئی ایک لاکھ سال قبل کے تمام دفینے ان آلات اور اسی قسم کی دیگر اشیاء سے مالا مال ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اوزار سے بھونڈا پن بھی بہ تدریج دُور ہو رہا ہے، اس لئے کہ ان چیزوں میں رندوں، برموں، چھڑیوں، کلھاڑیوں، اور گوپھنوں کی بہ آسانی شناخت ہو سکتی ہے۔

اب ہم انسانوں سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ آیندہ باب میں ایک دوسری نوع کا ذکر کیا جائے گا جو حقیقی معنوں میں انسان تو نہ تھی لیکن انسانوں سے نسبتاً قریبی مشابہت رکھتی تھی۔

باب تیسرا

نیانڈرٹالی انسان

تقریباً پچاس ساٹھ ہزار سال قبل ہماری زمین پر ایک ایسی مخلوق آباد تھی جس کے آثار کے متعلق چند سال پہلے تک عام خیال تھا کہ یہ آثار خالص انسانی ہوں گے۔ یہ مخلوق نیانڈرٹال میں بستی تھی جو موجودہ جغرافی حدود کے اعتبار سے جرمنی کا علاقہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہئیے کہ افریقہ اور ایشیا کا بیشتر حصہ ماہرین فن کی نظروں سے اوجھل ہے، اور تحقیق و تجسس کو اس پیچ در پیچ گرہ کے سلجھانے کا موقع نہیں

ملا۔ اس لئے یہ بتلانا مشکل ہے کہ ان دونوں
براعظموں میں انسان نما مخلوق یا اولین حقیقی انسان
کب نمودار ہوئے اور یہاں کس قسم کی زندگی بسر
کرتے تھے۔

چونکہ اولین انسان نما جانداروں کے آثار نیانڈرٹال
سے برآمد ہوئے، اس مناسبت سے انھیں نیانڈرٹالی
انسان کہتے ہیں۔ یہ نیانڈرٹالی انسان تنگ پیشانی،
بڑی محرابی ابرو، اور بھاری اور ابھرے ہوئے
جبڑے رکھتے تھے۔ اُن کے جبڑوں کی ساخت
سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قوت گویائی سے
محروم تھے۔ گردنیں بھی کچھ اس قماش کی واقع ہوئی
تھیں کہ سر کا پھیرنا اور بلا تکلّف اوپر کی طرف
دیکھنا اُن کے لئے دشوار تھا۔ اُن کے ڈاڑھوں کی

ساخت ہماری ڈاڑھوں سے مختلف تھی۔ اُن کے ٹھُڈیاں نہ ہوتی تھیں۔ کھوپریاں انسانی کاسۂ سر ہی کی طرح ہوتی تھیں، البتہ بھیجا پیچھے کی طرف کسی قدر بڑا اور سامنے کی جانب چھوٹا ہوتا تھا۔

یہ لوگ آگ روشن کرنا جانتے تھے۔ سردیوں میں غاروں کے اندر پناہ لیتے، اور اگر موسم موافقت کرتا تو کھُلی ہوا میں پالتی مار کر بیٹھتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ وہ، بد وضع چمڑوں سے ستر پوشی کرتے تھے۔ انسانوں کی طرح داہنے ہاتھ سے کام لیتے، اور پتھر کے ہتھیار تیار کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ، لکڑی کے ہتیار بھی بناتے تھے جن کے آثار اب مفقود ہیں۔ وہ، پانی کے قریب چھوٹے چھوٹے جرگوں میں رہتے تھے، اس لئے کہ یہ لوگ ظروف یا برتن بنانا

نہ جانتے تھے۔ جرگے میں عورتیں، لڑکیاں اور لڑکے بھی ہوتے تھے۔ لیکن سب کی رکھوالی ایک سن رسیدہ بوڑھا کرتا جو جرگے کا والی یا سردار ہوتا تھا۔ جب لڑکے بڑھ کر "بوڑھے" کی صنفی آزادی میں حایج ہوتے، تو جوشِ رقابت میں "بوڑھا" دست و گریباں ہوجاتا تھا۔ اور اس طرح جرگے کا والی یا تو لڑائی میں مارا جاتا، یا لڑکوں کو مار کر بھگا دیتا۔ بعض لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ بھاگ جاتیں، یا اِن لڑکوں میں سے بعض کچھ دِنوں اِدھر اُدھر ٹکراتے پھرتے اور کسی دوسرے جرگے سے حسب دلخواہ کوئی لڑکی اُڑا لے جاتے۔

پودے، ساگ پات، جنگلی پھل، میوے، پرندوں کے انڈے اور بچے، شہد، کیڑے، مینڈک، ہاتھ
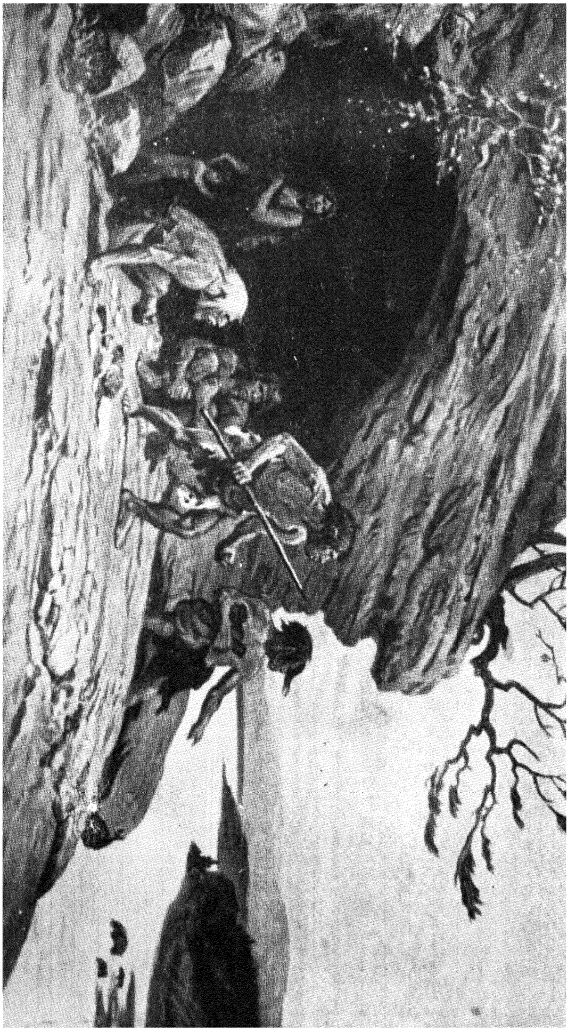
یہ لوگ بعض اوقات جانوروں کو نیزوں سے مارتے اور شکار کردہ
جانوروں کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔

سے پھنسنے والی مچھلیاں، چھوٹے چھوٹے پستانیاں (جن کو وہ پتھر یا لکڑیوں سے مارتے تھے) ۔ انھیں چیزوں پر اُن کی گزران تھی ۔ مُردہ جانوروں کا گود بھی رغبت کے ساتھ کھاتے تھے ۔ بعض اوقات جانوروں کو نیزوں سے مارتے، اور شکار کردہ جانوروں کے گوشت سے پیٹ بھرتے تھے ۔ بھوک سے مغلوب ہوتے تو اُنھیں اپنے کمزور ساتھیوں اور بچوں کے مارنے اور کھانے میں بھی دریغ نہ ہوتا ۔

ہزاروں سال تک نیانڈرتھالی انسان یورپ کی (جس کا ایک بڑا حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا) خاک چھانتے رہے ۔ بعد ازاں اب سے کوئی تیس ہزار سال قبل ایک نسبتاً زیادہ ذہین اور سمجھ دار نسل جس کے افراد آپس میں مِل جُل کر رہتے اور بات چیت کرتے

تھے، ایشیا یا افریقہ کی جانب سے چکّر لگاتی ہوئی
نیانڈرٹالی حدود میں پہنچی - یہ تھے اولین حقیقی
انسان جن سے ہمارا رشتۂ ہم جنسی ملتا ہے۔ اُن
کی گردنیں، انگوٹھے، کاسۂ سر، اور دانت ہماری
ہی طرح تھے - ان لوگوں نے نیانڈرٹالیوں کو
غاروں اور جھگھٹوں سے نکال باہر کیا، اور آہستہ
آہستہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے ان کا نام
مٹا دیا -

باب چوتھا

قدیم عصر الحجر
(اولین حقیقی انسان)

اِن نو وارد انسانوں نے صحیح معنیٰ میں یورپ کی آوارہ گردی نہیں کی۔ بلکہ ہوا یہ کہ صدی بہ صدی جیسے جیسے آب و ہوا سازگار ہوتی گئی، یہ لوگ غذا کی تلاش میں نئے اقطاع کی طرف بڑھتے گئے۔ اُن کے اُستخوانی باقیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسل انسانی کی دو مختلف انواع سے اُن کا تعلق تھا۔ ان میں سے ایک نوع دراز قامت، اونچی ناک، چوڑے چہرے، اور جسیم بھیجے رکھتی تھی،

اور دوسری نوع کے خط و خال صاف طور پہ حبشی واقع ہوئے تھے۔ اِن دونوں انواع کا شمار وحشیوں میں ہوتا ہے، گو اس وحشیانہ رنگ میں بھی اُن کو نیانڈرٹالیوں پر ترجیح حاصل تھی۔

یہ لوگ اپنے جسم کو رنگتے، سیپ کے ہار بنا کر پہنتے، ہڈیوں اور چٹانوں پر طرح طرح کی شکلیں کھودتے، پتھر اور ہڈیوں کی مورتیں بناتے، اور وحوش و طیور کے بد وضع مگر بسا اوقات کامیاب خاکے غاروں کی دیواروں پر کھینچتے تھے۔ وہ، مختلف قسم کے ہتیار بنایا کرتے تھے جو ساخت اور ڈول میں نیانڈرٹالی ہتیاروں سے بہتر ہوتے تھے یہ لوگ محض شکاری تھے۔ اور نیزوں اور گوپھنوں سے شکار کھیلتے تھے، یا بعض اوقات جال میں

قدیم عصر حجری انسان

یہ لوگ وحوش وطیور کے بد وضع مگر بسا اوقات کامیاب خاکے غاروں کی دیواروں پر کھینچتے تھے۔

پھنسا کر جانوروں کو مارتے تھے۔ اَرنا بھینسا، بڑا ہو، اور جنگل شکار کرتے، اور گھوڑے کو بہت رغبت سے کھاتے تھے۔ جانوروں کے دودھ سے غذا کا کام لینا نہ جانتے تھے۔ پالتو بھیڑوں یا مویشیوں کے مصرف سے بھی محض ناواقف تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رہنے کے لئے ان لوگوں کے پاس مکان نہ تھے۔ وہ، غاروں میں رہا کرتے تھے گو اس بات کا امکان ہے کہ چمڑوں کے خیمے بھی اُن کے پاس ہوں گے۔ وہ، بالکل ناقص وضع کے چراغ روشن کرتے تھے۔ مٹی کی مورتیں بناتے تھے، لیکن برتن بنانے پر اُنھیں کبھی دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ کھانے پکانے کے سامان چونکہ اُن کے پاس نہ تھے، اس لئے اُن کی طباخی بالکل ابتدائی

یا ایک سرے سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ لوگ زراعت، سبد بافی، یا پارچہ بافی سے قطعی بے بہرہ تھے، اور شاید ہی تیر و کمان کا مصرف سیکھا ہو۔ وہ، اپنے پیشروؤں کی طرح کڈھب ہتیار رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم عصر الحجر میں اِن لوگوں کا شمار ہوتا ہے۔

قدیم عصر الحجر اب سے کوئی دس بارہ ہزار سال پہلے تک رہا۔ اس کے بعد پھر ایشیا یا افریقہ کی جانب سے ایک اور نسل انسانی نمودار ہوئی جو یورپ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نسل کے افراد بھی پتھر کے ہتیار رکھتے تھے۔ اُن کے حجری اوزار بہت صاف اور جِلا دار ہوتے تھے اس لئے اُن کو جدید عصر الحجری انسان کہتے ہیں، یہ جدید عصر الحجری رفتہ رفتہ تمام یورپ پر مسلّط ہو گئے۔

ٹھیک طور پر تبلایا نہیں جا سکتا کہ قدیم عصر الحجری انسانوں کا یورپ میں کیا حشر ہوا۔ ممکن ہے کہ وہ ایک سرے سے ناپید ہو گئے ہوں، یا یہ کہ برفا ہو اور رجعت برف کے ساتھ ساتھ وہ بھی شمال مشرقی اقطاع کی طرف بڑھتے گئے ہوں۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جدید عصر الحجری حملہ آوروں کے ساتھ وہ گھل مل گئے ہوں گے۔

بہر حال ان جدید عصر الحجریوں کی آمد کے بعد ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ آتا ہے جبکہ یورپ وحشیانہ زندگی سے گزر کر بربریت کی منزل پر قدم رکھتا ہے۔

~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~

باب پانچواں

جدید عصر الحجر

جدید عصر الحجری جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا، نرے وحشی نہ تھے اور نہ اپنے پیشروؤں کی طرح محض شکار اور بے سروسامانہ زندگی پر اُن کی گزران تھی۔

یہ لوگ جھونپڑوں میں رہا کرتے تھے۔ زیادہ تر چمڑوں سے ستر پوشی کرتے تھے۔ سَن سے ایک قسم کا موٹا کپڑا بھی تیار کرتے، اور سَن کے جال بناتے تھے۔ انھیں لوگوں سے پارچہ بافی اور سبد بافی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اُن کے پاس اناج بھرنے

جدید عصر الحجری انسان

یہ لوگ جھونپڑوں میں رہا کرتے تھے اور زیادہ تر چمڑوں سے ستر پوشی کرتے تھے۔

کے لیئے ٹوکرے ٹوکریاں، اور کھانے پکانے کے
لیئے برتن بھانڈے بھی ہوتے تھے۔ تالابوں اور
دریاؤں کے کنارے بسنے والے کشتیاں بھی بناتے
تھے۔

اُن کے خاص ہتیاروں میں چوبی دستوں کی
کلہاڑیاں اور تیر و کمان بڑے کار آمد ہتیار تھے۔
پتھر کے نہایت خوش وضع پیکاں بناتے تھے جو
تیر میں بالکل پیوست ہو جاتے تھے۔
لومڑی، ارنا بھینسے، ہرن اور جنگلی سور کا شکار
کرتے، لیکن خرگوش سے احتراز کرتے تھے اس
لیئے کہ اس کے گوشت کے متعلق عام وہم تھا کہ
انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔
یہ لوگ مویشی، بھیڑ، بکریاں، سور اور کتے

پالتے تھے ۔ خیال ہے کہ دودھ کے استعمال کا وقوف بھی پہلے پہل انھیں کو ہوا۔

لیکن محض شکار، یا پالتو جانور، یا خود رو اشیا پر اُن کی زندگی کا مدار نہ تھا۔ وہ اپنے بَل بوتے پر کھیتی کرتے تھے۔ تخم ریزی سے پہلے ایک لمبوترے بانس سے زمین جوتتے تھے۔ زیادہ تر گیہوں، جو اور باجرے کی کاشت کرتے تھے۔ لیکن ابتدا میں اُن کی کھیتی باڑی بے ڈھنگی اور بے اصول تھی۔ اناج دو پتھروں کے درمیان دَلتے یا پیستے، اور ضرورت کے وقت کھانے کے لئے رکھ چھوڑتے تھے۔ خمیر تیار کرنا نہ آتا تھا جس سے یہ ظاہر ہے کہ خمیر سے نشہ آور مشروبات کا تیار کرنا بھی نہ جانتے تھے۔

موسیقی کی ابتدا بھی انھیں لوگوں نے کی۔ اُن

کے پاس بانسریاں اور ہڈی کی سیٹیاں ہوا کرتی تھیں
مٹی کے برتنوں سے سفالیں ڈھول بناتے تھے۔ بعض
اوقات درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کرکے جھلّی چڑھاتے
اور اُن سے ڈھول کا کام لیتے تھے۔ بہت ممکن ہے
کہ کمان کو دیکھ کر تانت سے کسی نہ کسی طرح کے
ساز بنانے کا خیال اُن کے ذہن میں پیدا ہوا ہو۔
عجب نہیں کہ اِن لوگوں نے گیت بھی بنائے ہوں
اس لئے کہ الفاظ کا خاصہ ذخیرہ اُن کے پاس موجود
تھا۔

جدید عصر الحجریوں کے قبائل گانوؤں میں رہا
کرتے تھے۔ بسا اوقات اِن گانوؤں کا آپس میں
لین دین بھی ہوا کرتا تھا۔ کاروبار نے باہمی اختلاط
و ارتباط اور تبادلۂ خیالات کی راہ میں بہت کچھ

سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح جدید عصر الحجری
ترقی کی رفتار دن بہ دن تیز ہونے لگی۔

یہ جدید عصر الحجر اب سے تقریباً دس ہزار
سال پہلے تک نہ صرف یورپ بلکہ دُنیا کے مختلف
اقطاع پر محیط رہا۔ لیکن دو تین ہزار سال کے
اندر ہی اندر ہندوستان، سامرستان، مصر اور غالباً
چین کے باشندوں نے بھی دھاتوں کا استعمال شروع
کردیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ان ممالک میں
یہاتی اور بربری زندگی کا دَور ختم ہوجاتا ہے، اور
نسانی تمدن اور شہری زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

لیکن اس کا تفصیلی ذکر کرنے سے پہلے یہ بیان
دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قدیم و جدید اعصار الحجر
ی انسان کے خیالات و عقائد کیا تھے۔

باب چھٹواں

ابتدائی تخیلات و عقائد

اولین انسان غور و فکر کے اُلجھیڑوں سے بالکل آزاد تھا۔ اپنی ابتدا اور انتہا کی اُسے کوئی سُدھ نہ تھی۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات ہنسنے کھیلنے، ناچنے کودنے، نقالیوں اور خوش فعلیوں میں گزارتا تھا۔ کبھی کچھ سوچتا بھی تھا تو محض اُن اشیاء کے متعلق جو اُس کے گرد و پیش ہوا کرتی تھیں۔

پھر جب غور و فکر کی طرف انسان کے قدم بڑھے ہوں گے تو اغلب ہے کہ وہ ایک طفلِ کم سِن کی طرح خیالی تصورات کے پُل باندھتا ہوگا،

یا یہ کہ مختلف خیالات اور طرح طرح کی مورتیں اُس کے حساس ذہن میں خود بخود صورت پذیر ہوتی ہوں گی۔

جان دار اور بے جان اشیاء میں امتیاز کرنے کی اُس میں صلاحیت نہ تھی۔ اگر کسی چیز سے ذرہ بھی گزند پہنچتی تو وہ جھنجھلا کر اُسے لتیانا شروع کر دیتا۔ ندی نالوں کے پُر شور بہاؤ کو دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتا۔ تاریکی، بجلی کی کڑک، ہوا کے تیز جھونکے اور اس قبیل کے تمام مظاہر بھی اُس کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرتے تھے۔ بعض اشیاء کو اپنا دوست اور بعض کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ عجب نہیں کہ اسی خیال کی کارفرمائیوں سے دیوتاؤں کا تصور صورت پذیر ہوا ہو۔

دوست اور دشمن دیوتاؤں کے منانے اور
خوش رکھنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار
کی جاتی تھیں۔ اِن تدابیر کے سُجھانے اور صلاح
مشورہ دینے میں واقف کار بوڑھے بوڑھیوں کو
خاص اہمیت حاصل تھی۔ دیوتاؤں کے غضب سے
بچانے اور بلاؤں یا بیماریوں کے دُور کرنے کے لئے
بوڑھے بوڑھیاں طرح طرح کے جنتر منتر، ٹونے
ٹوٹکے، اور دوا دارو تجویز کرتے تھے۔ یہیں سے
کہانت اور ساحری کی ابتدا ہوتی ہے جس
کی بدولت گمراہ کن روایات اور توہمات میں روز
بروز اضافہ ہونے لگا۔ ان توہمات میں ایک اہم
عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد بھی بوڑھے بوڑھیاں
نہایت پُر اسرار طور پر کسی بعید اور پُر ہیبت مقام

سے اپنے قبیلے کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ بوڑھے بوڑھیاں بھی قبیلے کے دیوتاؤں میں شمار ہونے لگے۔

جدید عصر الحجر میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایک نئی اور ظالمانہ رسم انسانی قربانی کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ۔ یہ رسم فصل بونے کے موقع پر نہایت پابندی اور اہتمام کے ساتھ ادا کی جاتی تھی ۔ قربانی کے لئے انتخاب بھی ایسے کا ہوا کرتا تھا جو ہر ایک کی نگاہ میں عزیز اور ہر لحاظ سے منتخب ہوتا ، جس کی توقیر پرستش کی حد تک کی جاتی ، اور جو اپنی جان دیوتاؤں کی نذر کرنے کے بعد قبیلے کے سرپنچ دیوتاؤں میں شمار ہونے لگتا ۔

جدید عصر حجری انسان نہ صرف تخم ریزی ہی کے موقع پر قربانی کی رسم ادا کرتے تھے، بلکہ اس قیاس کی بھی گنجائش ہے کہ جب کسی مصیبت یا بلا کا سامنا ہوتا، یا یہ کہ دیوتاؤں کو غضبناک دیکھتے تو بچوں اور عورتوں کی بھینٹ چڑھانے میں بھی یہ لوگ دریغ نہ کرتے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جدید عصر الحجری دُنیا میں کاہنوں کا طبقہ جسے ادائے قربانی کے طریقے ازبر ہوتے تھے، کتنا مقتدر اور با اثر نہ رہا ہوگا۔

اولین کاہن اپنے زمانے کا طبیب اور عالم بھی ہوتا تھا۔ لیکن اُس کے معلومات کی کُل کائنات چند بے بنیاد تجارب پر مبنی تھی جو

بسا اوقات غیر معتبر اور اکثر لغو ہوتے تھے۔ اُس کا علم، اسباب و نتائج کا ایک بے ربط مجموعہ ہوا کرتا تھا اس لئے کہ پہلے پہل انسان اسباب و علل کے قائم کرنے میں تنقیدی نگاہ سے کام نہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر متمدن انسان کی مغالطہ آمیز علت آفرینیوں کو ہم بے تُکی لِم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اولین کاہن بے تُکی لِم باندھنے میں بڑا کمال رکھتے تھے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ انھیں ناتراشیدہ خیالات و تصورات، مغالطوں، خود فریبیوں اکابر پرستیوں، لم بندیوں، اور اس قبیل کے لایعنی عقائد و توہمات سے تمدنی زندگی کا خاکہ تیار ہو رہا تھا جس کی بدولت انسانوں کا ذہنی اور حسّی طور

پر مربوط اور ہم آہنگ ہونا لازمی تھا۔ جیسے جیسے
ذخیرۂ الفاظ اور ادائے مطلب کی صلاحیت میں
نمایاں اضافہ ہونے لگا، انسانوں نے اپنے ذاتی اور
قبائلی روایات کو محفوظ کرنے کی کوشش شروع
کی۔ لیکن آنے والی نسلوں کو اپنی روایات سے
باخبر کرنے کا اُن کے پاس بجز تکلم اور کوئی ذریعہ
نہ تھا، جو مرورِ ایام کے ساتھ دہقانی گپ شپ
کی طرح غیر معتبر ہوتا گیا۔

تحریر کی ایجاد اور وسعت پذیری، ترقی تمدن
کے حق میں کامیابی کا پہلا زینہ تھی۔

باب ساتواں

تحریر کی ابتدا

تحریر کے اولین مراحل پیش تاریخی عہد سے وابستہ ہیں، اور اس کی ابتدا قدیم عصر الحجر کے خاکوں اور تصاویر سے ہوتی ہے۔ انسان اپنی بے چین طبیعت سے مجبور تھا کہ وہ اشیار کے سیدھے سادے خاکے کھینچنے پر اکتفا کرتا۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل میں اپنے خیالات اور کارناموں کو قلم بند کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ چنانچہ یہ تصویریں بعد کو ادائے مطلب یا خیال کی علامتیں یا نشانیاں بنتی گئیں، اور اس طرح تصویر نما تحریر کی داغ بیل

پڑی جس کا پتہ دُنیا کے وحشی اور بربری انسانوں کی تحریروں سے اب بھی ملتا ہے۔

قدیم تصویر نما تحریر میں ہر ایک تصویر کسی ایک شئے کی طرف دلالت کرتی تھی۔ مثلاً ایک مربع اور ایک خمیدہ خط جو ڈھکن کی طرف خیال کو منتقل کرے، لفظِ صندوق کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ علیٰ ہذا صندوق کے اندر ایک مدّور علامت کے اضافے سے نقدی صندوق مُراد ہوتا تھا۔

ارتقائے تحریر کا ایک نیا دَور اُس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ تصویروں کے امتزاج سے ایسے خیال کا اظہار کیا جاتا جو اُن تصاویر کے اصلی مفہوم سے خارج ہوتا تھا۔ اس کی ایک فرضی مثال اُردو میں یہ ہو سکتی ہے کہ بُزدل کا مفہوم ادا

کرنے کے لئے بکری یا بُز کی تصویر کے محاذی
دل کی تصویر کھینچ دی جائے۔
ارتقائے تحریر کا آخری اور نہایت اہم مرحلہ وہ
تھا جبکہ حروف تہجی اختراع ہونا شروع ہوئے
جن کی بدولت ادائے مطلب میں اختصار اور
سہولتیں پیدا ہو گئیں۔ سب سے پہلے مصریوں
نے اِس کی طرف توجہ کی۔ لیکن بد قسمتی سے
ان لوگوں نے تحریر کے پارینہ اسالیب کو بُکلّی
ترک نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی تحریری
کوششیں ارتقائے تحریر کے جملہ مراحل کا معجون
مرکب ہی رہیں۔
اب سے کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے
جبکہ اوّلین تمدنوں کا ہندوستان، سامرستان،

مصر اور چین میں آغاز ہوا، یہاں کے باشندے ارتقائے تحریر کے مختلف منازل سے گزر رہے تھے۔ لیکن یہ تعیّن کرنا دشوار ہے کہ اس زمانے میں ان ممالک نے فرداً فرداً کس حد تک ترقی کی تھی۔ البتہ چینیوں کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں حروفِ تہجی تک پہنچنا کبھی بھی نصیب نہیں ہوا۔ اُن کی تحریر آج بھی علامت نما تحریر کا ایک عجیب و غریب گورکھ دھندا ہے جہاں ہر لفظ کے لئے جداگانہ علامتیں مقرر ہیں مثلاً لفظ آفتاب جو ابتدا میں ایک بڑے منقوط دائرے کی شکل میں لکھا جاتا تھا، بعد کو مو قلم و نیز دیگر سہولتوں کی خاطر مستطیل شکل میں مبدل ہو گیا۔

الغرض انسانی تمدن و معاشرت کی ترقی
میں تحریر کا حصہ زبردست ہے۔ اسی کی بدولت
مختلف اقطاع و ازمنہ میں صدہا ذہن انسانی
کا ایک دوسرے پر اثر پڑتا رہا۔لیکن ہزاروں سال
گزرنے کے بعد کہیں دُنیا کو تحریر کی پوری
اہمیّت کا احساس ہوا، اس لئے کہ ایک زمانے
تک تصانیف کو چھاپے کے ذریعے متعدّد نسخوں
میں منتقل کرنے کا خیال ذہن انسانی میں صورت پزیر
نہیں ہوا، اور تصانیف کی اشاعت کا مدار صرف
اِسی پر تھا کہ کسی نسخے کی وقت واحد میں ایک
نقل کرلی جاتی تھی۔

اب ہم اولیت تمدنوں کے دوسرے پہلوؤں
پر تا بمقدور روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

باب آٹھواں

تمدن کے اوّلین نقوش

(ہندوستان)

مشرق تمدن عالم کی جنم بھوم ہے۔ اُفقِ تاریخ پر ہندوستان، سامرستان اور مصر اُس وقت نمو دار ہوئے جبکہ اعصار الحجر کی بربری اور بہیمی زندگی کا معمورۂ عالم پر دَور دورہ تھا۔ رفتہ رفتہ اب سے کوئی سات آٹھ ہزار سال قبل، قبیلہ واری تنظیم کا طلسم ٹوٹنے لگا اور ان ممالک میں انسانوں نے ننھی ننھی ٹولیاں قائم کرکے شہری زندگی کا نقشہ جمانا شروع کیا۔

تاریخی عہد کا آغاز بھی انھیں ممالک سے ہوتا ہے جبکہ انسانوں نے شکار بازی، ماہی گیری، اور نشبانی سے گزر کر زراعت، تجارت، اور صنعت و حرفت کی طرف باقاعدہ طور پر توجہ کرنا شروع کی۔

چینیوں نے بھی اسی زمانے میں یا غالباً کچھ بعد، اپنے طور پر ایک تمدن کی داغ بیل ڈالی تھی۔ لیکن ماہرین آثار قدیمہ کا فراہم کردہ مواد اس قدر ناکافی ہے کہ چینی تمدن کا تفصیلی احوال بیان کرنے سے ہم خود کو قاصر پاتے ہیں۔

ہندوستان کے بارے میں بھی ہمارے پاس کچھ زیادہ اطلاعات نہیں ہیں۔ لیکن حال میں

ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے دفینۂ ارضی کے ذریعے کچھ آثار برآمد کئے ہیں، جن سے یہ پتہ لگتا ہے کہ سامرستان اور مصر کے ساتھ ساتھ عین اُسی زمانے میں ہندوستان میں بھی ایک تمدن برسرِ ترقی تھا۔

قدیم ہندوستان کے باشندے دریاؤں کے کنارے بستیوں اور شہروں میں آباد تھے۔ دریائے سندھ اور غالباً گنگا کے کنارے ان لوگوں کے متعدد شہر تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ جنوبی ہند میں بھی اس زمانے میں شہر رہے ہوں گے۔ وادیٔ سندھ کے برآمد شدہ آثار سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے شہر خوش وضع اور وسیع الرقبہ ہوتے تھے، نیز یہ کہ اِن شہروں کی بلدی تنظیم نہایت مربوط

ہوتی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں کے خاکے، اور
بدرّوی نظام ـــــ عام اس سے کہ وہ خانگی ہوں
یا پبلک ـــــ نہایت قابل تعریف تھے۔ شہروں
میں بڑے بڑے پیراکی حمّام خانے یا حوض بھی
ہوا کرتے تھے۔

مکانات اور دیگر عمارتیں خام اور پختہ دونوں
طرح کی اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں۔ مکانوں
کی وضع نہایت سادہ اور چھتیں سپاٹ ہوتی تھیں
طغیانی یا سیلاب باراں کی دستبرد سے مصئون
رکھنے کی خاطر بلند چبوترے قائم کرکے اُن پر
مکان تعمیر کرتے تھے۔ تزئین سے اگر کام بھی
لیا جاتا ہوگا تو لکڑی یا چوبینے پر (جس سے
دروازے، کھڑکیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں) نقش
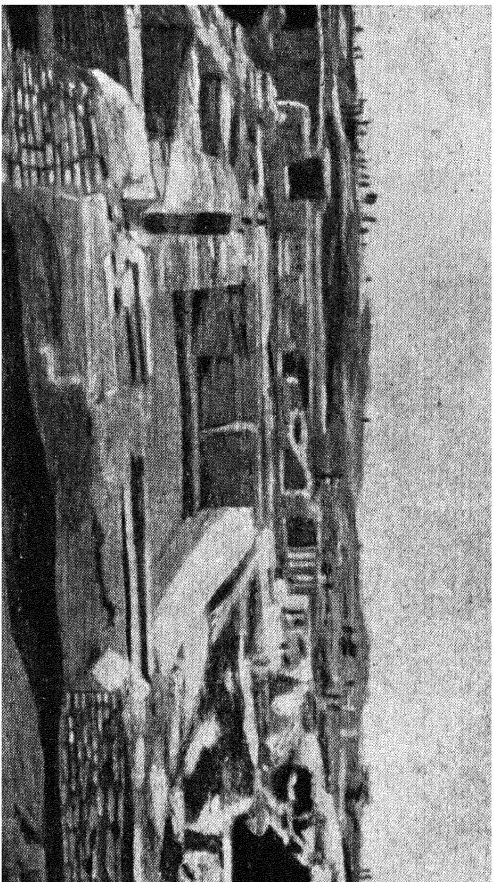
قدیم ہندوستانی شہروں میں بڑے بڑے پیراکی حمام یا حوض ہوا کرتے تھے

و نگار کرتے رہے ہوں گے۔ صحن یا مکانوں کے اندرونی حصے میں اینٹوں کا فرش ہوا کرتا تھا۔ بعض عمارتوں میں کنوئیں بھی ہوتے تھے۔ اور اکثر و بیشتر مکانوں کا امتیازی خاصہ پختہ حمام خانے ہوا کرتے تھے جن کی موریاں سڑک کی نالیوں سے جا ملتی تھیں۔

شہروں میں تین چار قسم کے مختلف النوع باشندے بستے تھے جن کے لباس، وضع قطع، اور بالوں کی داشت بھی مختلف ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

زیورات میں ہار، بازو بند، انگوٹھیاں، کمر پٹے بالیاں، پازیب، اور کڑے عام طور پر پہنے جاتے تھے۔ اس فہرست سے ہم اُن کے زیوروں کی

وسعت اور تنوّع کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ گہنے بالعموم قیمتی معدنی یا غیر معدنی اشیاء سے بنائے جاتے تھے — مثلاً چاندی، سونا، ہاتھی دانت سیپ، منضمد شیشہ وغیرہ۔ مذکورۂ بالا زیورات میں سے بعض، عورتوں اور مردوں میں مشترک تھے۔ سونے چاندی کے کام میں سُناروں کو مہارت "تامّہ حاصل تھی۔

خاص طور پر زراعت، پارچہ بافی، اور تجارت پر باشندوں کی گزران تھی۔ گیہوں اور جَو کی کاشت عام تھی۔ حیوانی غذاؤں میں مرغ و ماہی، گائے، بھیڑ اور سور کا گوشت مرغوب غذائیں تھیں۔ اغلب ہے کہ دودھ، سبزی اور فواکہات کا بھی خاصہ صرفہ تھا۔ ماکولات کی فراوانی اور گرد و پیش

کے ممالک سے تبادلۂ اشیاء کی سہولتوں کے باعث تجارت اور بیوپار کو بے حد فروغ حاصل تھا۔ پارچہ بافی کا رواج دولت مندوں اور غریبوں میں عام تھا۔ اغلب ہے کہ اُون اور روئی دونوں کاتے جاتے تھے۔

چاندی سونے کے علاوہ دیگر دھاتی اشیاء مثلاً تانبے، جست اور کانسے کے استعمال سے بھی یہ لوگ روشناس تھے۔ سونے کی بہ نسبت چاندی کا مصرف زیادہ تھا۔ ہتیار عام طور پہ کانسے سے بنائے جاتے اور بالعموم گوپھن، غلیل گرز، اور خنجر پہ مشتمل ہوتے تھے۔ برتن بھانڈے بھی کانسے ہی کے ہوا کرتے تھے۔

جانوروں میں سانڈ، بھینس، بھیڑ، ہاتھی، اونٹ

سور، اور پرندے، پالے اور سدھائے جاتے تھے۔ لیکن جہاں تک بر آمد شدہ آثار سے پتہ لگتا ہے گھوڑے کے مصرف سے یہ لوگ نا واقف تھے۔

ماہرین آثار قدیمہ نے کچھ کھلونے بھی بر آمد کئے ہیں جن کا یہاں پر ضمناً تذکرہ کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ ان کھلونوں میں سیٹیاں، گھر گھرے، عورتوں مردوں اور جانوروں کی سفالیں مورتیں، مٹی کے برتن اور گاڑیاں شامل ہیں۔ بعض کھیلوں کے مُہرے اور پانسے، سنگ مرمر کے بنے ہوتے تھے۔

مجسّمہ ساز اور نقش گر خاص طور پر اُن جان داروں کی صورت کشی میں جن سے وہ رو شناس تھے، بڑا کمال دکھاتے تھے۔ اُن کا

کام حقیقت نگارانہ صداقت شعاری، اور اُستادانہ مہارت کی جھلک رکھتا ہے۔ لیکن اُن کے کمھاری برتن کیا بہ لحاظ شکل، اور کیا بہ لحاظ نقاشی کچھ زیادہ تعریف کے قابل نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ خوش وضعی کا یہ فقدان اس وجہ سے ہو کہ بڑی تعداد میں کسی چیز کی پیدا آوری سے صنعتی اشیا کے حُسنِ ظاہری پر لازماً اثر پڑتا ہے۔ اس لئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ اُن کی کمھاری صنعت اولین مراحل پر تھی۔

اُن کے مذہبی معتقدات کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کے ہاں ماتا دیوی کی پوجا عام تھی، اور مادر پرستی کا یہ طریقہ مادرِ فطرت کی پرستش کے مماثل و مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ماتا دیویوں کی

مورتوں کے ساتھ ساتھ نر دیوتاؤں کی مورتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ حیوانات اور اشجار کی پرستش کا بھی رواج تھا۔ دریا بھی اُلوہیت نشان اور مقدس تصور کئے جاتے تھے۔ اعضائے تخلیق و تناسل کی پرستش کے بارے میں بھی کچھ ثبوت ملتا ہے۔

مُردوں کی تدفین یا رسوم تجہیز سے بھی جو اُن کے ہاں رائج تھیں، ہمیں ان لوگوں کے مذہبی عقائد اور توہم پرستی کا پتہ لگتا ہے۔ یہ لوگ یا تو مُردوں کو دفناتے یا لاش کو ایسے مقام پر ڈال دیتے تھے جہاں درندوں یا گوشت خوار پرندوں کا گزر ہوتا تھا۔ اس کے بعد گوشت خوردہ ہڈیوں کو سپرد گور کرتے تھے۔ ایک تیسرا طریقہ بھی تھا ـــــ وہ یہ کہ لاشیں جلا دی جاتی تھیں۔

اور راکھ کسی بڑے برتن میں رکھ کر دفنا دی جاتی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ لاش، یا ہڈیوں، یا راکھ کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں، ہتیار، زیورات، برتن، وغیرہ بھی دفن کئے جاتے تھے تاکہ مرنے والے کو دوسری دُنیا میں یہ چیزیں کام آئیں۔

ہمیں ان لوگوں کے مذہب و عقائد وغیرہ کے باب میں اور بھی دلچسپ معلومات بہم دست ہوتیں اگر اُن کی کسی مقدس کتاب کا انکشاف ہو جاتا۔ لیکن ان کی تحریریں جو اب تک بر آمد ہوئی ہیں، ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتیں اور نہ اُن تحریروں سے اُن کے سیاسی و اقتصادی حالات یا مروّجہ اخلاق پر جو ہندوستان کے اولین بلاد میں

رائج تھے، کوئی روشنی پڑتی ہے۔

اس لئے ہمیں مزید کھدائیوں اور ماہرین فن کی کامیاب کاوشوں کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اب ہم سامرستان اور مصر کا ذکر کریں گے جن کے متعلق ہمیں نسبتاً کچھ زیادہ معلومات حاصل ہیں۔
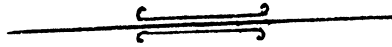
باب نواں

سامرستان اور مصر

(مذہبی اور ادبی رجحان)

اب سے کوئی سات آٹھ ہزار سال پہلے جبکہ پیش تاریخی عہد کا پردہ ہماری نگاہوں کے سامنے اُٹھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مصر کے باشندے دریائے نیل، اور سامرستان کے باشندے دجلہ و فرات کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں میں آباد ہیں۔ اِن میں سے اول الذکر حامی نسل، اور موخرالذکر غالباً دراوڑی نسل سے علاقہ

رکھتے تھے۔ یہ لوگ تقریباً تین چار ہزار سال
تک کارزار حیات کے مختلف شعبوں میں
مہتم بالشان ترقی کرتے رہے۔

سامری اور مصری شہروں کے متعلق ایک
امر خاص طور پر ذہن میں رکھنے کے قابل ہے۔
ہر شہر میں ایک یا متعدد معابد کا ہونا شہری
زندگی کا ممتاز خاصہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اولین
بلاد اور معابد کا تاریخ میں بہ وقتِ واحد ظہور ہوتا
ہے۔ معابد سے متعلق کاہنوں اور خدام کا
بسا اوقات ایک جم غفیر ہوا کرتا تھا جو مابہ الامتیاز
پوشاکوں میں ملبوس نظر آتا تھا۔ ان لوگوں کو
گھر بار سے کوئی واسطہ نہ ہوتا تھا۔ ان کا گھر
اور اُن کی دُنیا جدا تھی۔ رسم قربانی کی ادائی

اور دیوتاؤں کی پرستش اُن کا فرضِ اولیں تھا۔ یہ لوگ دیوتاؤں اور عام انسانوں کے مشترک پیام رساں تصور کئے جاتے تھے۔ کتب خانوں اور مدارس کا سارا انتظام اِنھیں معبد نشینوں یا کاہنوں کے تفویض ہوتا تھا۔ یہ مدارس اور کتب خانے معابد سے ملحق ہوتے تھے۔ سارا تعلیمی نصاب، نوشت و خواند پر منحصر تھا جس کی تکمیل کے لئے کئی برس درکار ہوتے تھے۔ نوشت و خواند سے بہرہ ور ہونے کے بعد ایک طالب علم مُنشیانہ خدمت انجام دینے کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی شخص کو خط لکھانا پڑھانا مطلوب ہوتا تو اُسے کسی منشی یا محرر کی ضرورت در پیش ہوتی۔ کتابوں کی نقل کرنے کے لئے بھی محرروں

کو مامور کیا جاتا تھا۔

سامریوں کے ہاں کتابت سفالیں تختیوں پر ہوا کرتی تھی۔ مصری لوگ ایک خاص قسم کے گہرے رنگ اور قلم سے پپائرس پر لکھا کرتے تھے۔ پپائرس در اصل ایک درخت کا نام ہے جو دریائے نیل کی دلدلوں میں بہ کثرت پیدا ہوتا تھا اور جس کے پرتیلے تنے سے متعدد کاغذ نما پرتوں کو جوڑ کر کاغذ کا کام لیا جاتا تھا۔

مصری اور سامری مذہب کے بارے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے عقائد در اصل ان عقائد و اوہام کی بہ تدریج ترقی سے پیدا ہوئے جن کی ابتدا پیش تاریخی عہد میں ہوئی تھی، اور جن کا پچھلے باب میں ہم ذکر

کر چکے ہیں ۔ مظاہر قدرت کی پرستش مصر اور سامرستان میں عام تھی ۔ چاند، ستارے، سمندر، زمین سب کے سب دیوتا یا دیوتاؤں کا مسکن تصور کئے جاتے تھے ۔ آفتاب کی پرستش کو خاص اہمیت حاصل تھی ۔

مصریوں نے جو مذہبی معاملات میں بے حد قدامت پسند واقع ہوئے تھے، اپنے وحشی آباو اجداد کا طریقۂ بہائم پرستی بہ دستور جاری رکھا تھا ۔ اُن کے دیوتاؤں کی مورتوں میں جانوروں کی شکل و شباہت کچھ نہ کچھ ضرور ہوا کرتی تھی ۔ کسی دیوتا کا سر، بندر کا ہوتا تو کسی کا ببر کا ۔ گیدڑ، سانڈ، بھیڑ، اور مگرمچھ جیسے جانور بھی خاص احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ اور ان میں

سے ہر ایک اپنی جگہ دیوتا، یا کسی دیوتا کی اُلوہیّت کا نشاں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم بعض مصری مفکرین کا ذہن ذاتِ واحد کے تصور سے نا آشنا نہ تھا۔

سامرستان میں ارواحِ سفلی کا وجود مذہبی عقیدے کا جزوِ اعظم ہوا کرتا تھا۔ لوگ دیوؤں اور بھوتوں سے جو عموماً عوارض، دیوانگی، حوادث، اور موت کا باعث تصور کئے جاتے تھے، خود کو گھرا ہوا پاتے تھے۔ ان فرضی موذیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے سامریوں کے ہاں جادو کا بھی رواج تھا۔ ہر ایک سامری اپنی رکھوالی کی غرض سے گھر کے دروازے پر کسی نہ کسی محافظ دیوتا کی مورت رکھتا، اور اپنے جسم پر گنڈے

تعویذ باندھتا تھا۔ کبھی بیمار پڑتا تو جادوگر یا عامل سے منتر یا عمل کے ذریعہ بھوت اُتارنے کا خواہشمند ہوتا۔ پیشین گوئی، قرعہ اندازی اور نجوم کا رواج بھی بہت عام تھا۔

مصری اور سامری عقائد میں یہ چیز بھی داخل تھی کہ جسم کے فنا ہونے کے بعد روح باقی رہتی ہے۔ تاہم مصری لوگ کالبدِ خاکی کو فنا کی دستبُرد سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسی خیال کی بدولت لاش کو مسالہ لگانے کی ضرورت درپیش ہوئی۔ اس کے بعد مومیائی لاش سپردِ گور کردی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ مصری افکار کے آخریں مراحل میں دُنیائے آب و گِل کے سوا ایک دوسری دُنیا کا تصور بھی ذہن انسانی میں صورت پذیر ہوا۔

اور اس نئی دُنیا کو جزا و سزا کا مقام تصور کیا جانے لگا جہاں روحِ انسانی کو محاسبۂ آخرت کا سنگین امتحان در پیش ہوتا۔ جو شخص جس نہج کی زندگی دنیا میں بسر کرتا، اُسی کے مطابق آخرت میں صلے کی توقع رکھتا۔ لیکن اس باب میں سامریوں کا عقیدہ، مصریوں سے مختلف تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسانی روحیں، اچھی اور بُری سب کی سب پاتال کی تیرہ و تار فضا میں نا مرادی کے دن گزارتی ہیں۔

مصری اور سامری ادب کا بیشتر حصہ مذہب کی کار فرمائیوں کا مرہون ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی ضمن میں مصریوں اور سامریوں کی ادبی کوششوں کا بھی ذکر کیا جائے۔

مصریوں کی کتاب رفتگاں مذہبی مناجات، دعاؤں، اور منتروں کے مجموعے کا نام ہے جس کا ازبر ہونا ماورائے قبر کی کڑی منزلوں سے گزرنے اور عالمِ ارواح میں داخل ہونے کے لئے کسی روح کی نجات کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اس کتاب کے ابواب میں ایک جگہ روح سے عالمِ آخرت میں محاسبہ ہونے کا بھی ذکر ہے۔ ہر ایک روح کو حیات ابدی کا طرّہ امتیاز حاصل کرنے کے لئے چند انکاری کلمات کا اعتراف کرنا، ناگزیر ہوتا تھا مثلاً یہ کہ میں نے کسی کا مال نہیں چُرایا، میں نے کسی کا دل نہیں دُکھایا، میں نے کسی پر جادو نہیں چلایا، میں کسی آقا کو اپنے غلام کے ساتھ بد سلوکی پر آمادہ کرنے کا باعث نہیں ہوا۔ اس

طرح اُن بیالیس گناہوں سے جن کا ارتکاب
مصری اخلاقیات میں بے حد مذموم سمجھا جاتا تھا؛
ایک انسانی روح اپنی بے تعلقی اور معصومیت
ظاہر کرنے کے بعد عالم ارواح کے مکینوں سے التجا
کرتی تھی کہ تمھارے جوار میں داخل ہونے کا کیا
وہ شخص اب بھی مستحق نہیں ہے کہ جس نے
بھوکوں کو کھانا، پیاسوں کو پانی، ننگوں کو کپڑا،
اور نراسوں کو آسرا دیا ہے۔ یہ امر دل چسپی سے
خالی نہیں کہ انکاری اعتراف کے بعض فقرے
توریت کے احکام عشرہ، اور اثباتی جملے انجیل
کے اخلاقی دستور العمل سے ملتے جلتے ہیں۔

سامرستان کی دونوں رزمیہ نظموں میں زیادہ
دلچسپ کتاب التخلیق ہے جس میں مردک

نامی دیوتا کا ذکر ہے جس نے ایک زبر دست
اژدھے کو مار کر دُنیا میں نظامِ امن قائم کیا۔
اژدھے کی تشبیہ میں در اصل کائنات کی اولین
ابتری کی طرف اشارہ ہے جبکہ کتابِ ہستی کے
اوراق کی شیرازہ بندی نہ ہوئی تھی۔ اس کے
بعد مُردہ اژدھے کی کھال سے مَردِک نے آسمان
کی چھت بنائی اور اس لاجوردی چھت میں
ستارے جڑے۔ پھر چاند کو پیدا کیا، اور شب کی
عملداری اُس کے سپرد کی۔ سب سے آخر میں
انسان پیدا کیا گیا کہ دیوتاؤں کی خدمت اور
پرستش کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔

دوسری رزمیہ، نظم طوفان عظیم سے متعلق ہے
جو خاطی انسان کی تنبیہ کے لئے دیوتاؤں کے ایما

سے نازل ہوا تھا۔ چنانچہ چھ دن، چھ رات
لگاتار مینہ برستا رہا۔ ساری زمین غرقاب ہوگئی
تمام انسان ڈوب کر مر گئے بجز ایک انسان اور
اُس کے رشتہ داروں کے جو ایک کشتی میں تیر
کر نکل گئے۔ یہ قصہ انجیل کے طوفان نوح
سے ایسی قریبی مماثلت رکھتا ہے کہ دونوں کو ایک
مشترک ماخذ کا مرہون سمجھنا چاہیئے۔

ایک مصری جنازہ

ہندوستان کی طرح مصر میں بھی مردے کے ساتھ ضروری
سامان زندگی بھی دفن کیا جاتا تھا۔ اس تصویر میں سب کے
پیچھے خدام ہیں جو یہ سامان لیے جا رہے ہیں۔

باب دسواں

سامرستان و مصر

(اوّلیں فرمانروا اور طبقاتی نظام)

گزشتہ باب سے یہ بہ خوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ سامرستان اور مصر کی اوّلیں شہری مملکتوں کی تشکیل میں مذہب اور کاہنوں کا حصّہ کتنا زبردست تھا۔ یہ خیال کرنا غلطی ہوگی کہ اولیں معبد نشیں یا کاہن سب کے سب عیّار اور شعبدے باز تھے، اور نوع انساں کی سادگی اور سریع الاعتقادی سے نا جائز فائدہ اُٹھانا اُن کا کام تھا۔ خصوصاً جبکہ

ہم جانتے ہیں کہ ایک زمانے تک نوشت و خ
درس و تدریس، اور جملہ مشاغلِ علمی کا ذوق اِ
لوگوں کی بدولت نشو و نما پاتا رہا۔ یہی لوگ
اپنے زمانے کے عالم تھے جو قدیم روایات او
افسانوں کو اکٹھا کر کے قلم بند کیا کرتے تھے۔
اپنے وقت کے مجتہد اور سائنس داں بھی
یہی لوگ تھے کہ اسرارِ قدرت کا معلوم کرنا اُن
کا کام تھا، اور بغیر اُن کے ذہنی زندگی کا وجو
یکسر ناممکن تھا۔

سامرستان کے اولیں فرمانروا بھی یہی
لوگ تھے، اس لیے کہ اپنے معتقدین کے
قلب و دماغ پر اُن کا گہرا تسلط تھا۔ وہ
مہیب تصورات اور خوش، آیند توقعات سے

سادہ دل انسانوں کو رام کر سکتے تھے ۔ اپنے حلقہ بگوشوں کو لڑائی کے لئے آمادہ کرنا بھی اُن کے نزدیک بڑی بات نہ تھی ۔ لیکن کاہنی نظام حکومت کی طرفہ قوت کے ساتھ، اس میں چند در چند خامیاں بھی موجود تھیں ۔ اُن کی قدامت پسندی اور اُن کے جملہ آئین حکومت فوجی تدبّر کے بالکل منافی تھے ۔ مزید یہ آن کا کاہن نہی شخص ہوا کرتا تھا جو دُنیا اور دُنیاوی کاروبار سے دستکش ہوکر اپنی زندگی دیوتاؤں اور معابد کی خاطر وقف کر دیتا تھا ۔ اُس کا یہ طرزِ عمل معابد کے داخلی کاروبار کی مضبوطی اور استحکام کی حد تک بالکل حق بہ جانب تھا ۔ علیٰ ہذا اپنے معابد یا دیوتاؤں کے حفظِ ناموس کی خاطر

ایک کاہن کا مرنا اور جینا بھی کوئی اعتراض کے قابل امر نہ تھا۔ لیکن دوسرے مذاہب سے اس کی بدگمانی اور بے پردہ عناد البتہ قباحت سے خالی نہ تھا۔ وہ، اپنے گاؤں یا شہر کے معابد یا دیوتاؤں کے علاوہ دوسرے معابد یا دیوتاؤں سے اپنے عقیدت مندوں کو ہمیشہ دور رکھنے کی کوشش میں سرگرم رہتا تھا۔ عام فرقہ پرستوں کی طرح کاہن بھی بلا کا کٹّر ہوتا تھا، اور جملہ مذہبی اداروں کی طرح تعصب اور فرقہ آرائی پہ کہانت کی بنیاد تھی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ فوجی قیادت کے لئے کاہنوں کا نا اہل ہونا و نیز دیگر مذہبی اداروں کی جانب سے اُن کی صریح رقابت اور

ذوقِ پیکار، یہ در اصل وہ خامیاں تھیں جن کی بدولت دُنیاوی بادشاہت معرض وجود میں آئی۔ ہوا یہ کہ کاہنوں نے اپنے فرقے کی حمایت میں جنگ کرنے کی خاطر فوجی سپہ سالار مقرر کرنا شروع کئے، جس کو حالت امن میں بھی کم و بیش وہی جنگی اختیارات حاصل ہوتے۔ رفتہ رفتہ فوج کے اس سپہ سالار نے اپنے گرد دوسرے عہدہ داروں کا ایک گروہ قائم کر لیا، اور حکومتی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کردی۔ شاہی اقتدار کے حصول کے لئے کاہنوں اور سپہ سالاروں کے درمیان کشاکش کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ مرور ایام کے ساتھ سپہ سالار کا قصر اور کاہنی معابد دو بڑے جنگی مرکز بن گئے۔ پہلے پہل تو

معبدی قوت کے آگے سپہ سالاری محاذ بے بس اور مجبور نظر آتا تھا۔ علم و فضل کا خزانہ اور نوشت و خواند کی کلید، معبد نشینوں ہی کے قبضے میں تھی۔ عوام کو اُن کے سامنے دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ لیکن کاہنی اداروں کی روز افزوں کشاکش اور نزاع میں سپہ سالاروں کو مقتدر بننے کا موقع ہاتھ آیا۔ پھر کیا تھا، سپہ سالاروں نے بھی دوسرے شہروں کے اسیر اور شکست خوردہ اداروں کے افراد کو اپنے قصر میں پناہ دینا شروع کی۔ رفتہ رفتہ کپتانی دربار یا قصر کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی۔ تجّار اور ممالک غیر کے باشندے بھی اِدھر کا رُخ کرنے لگے۔ سپہ سالاری قوت کا ستارہ روز بروز ترقی پر تھا۔

لیکن ملک کے سرتاج اور حقیقی مالک دیوتا ہی تصور کئے جاتے تھے جن کے آگے کپتانوں اور کاہنوں کی گردنیں بھی جھکتی تھیں۔ کسی شہر کی فتح کے ساتھ وہاں کے دیوتا کو لاکر اپنے معبد یا مندر میں مغلوبانہ حیثیت سے منتقل کرنا، زبردست سیاسی کامیابی کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ اس چیز کے آگے ایک بادشاہ کا دوسرے بادشاہ کو اسیر کرنا بھی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔

کاہنوں اور کپتانوں کے ضمن میں ایک امرِ خاص کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی کپتان یا سپہ سالار کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کا اُس وقت تک یقین نہ ہوتا تھا تب تک کاہن اُس کو خدا کا بیٹا اور نائب خدا

تسلیم نہ کر لیتے ۔ بہر حال سامرستان میں بادشاہت
کا ظہور اس طور پر ہوتا ہے ۔ رفتہ رفتہ سپہ سالا
کاہنوں پر غلبہ پاکر اُن سے بھی زیادہ با اثر او
ذی مرتبت بن بیٹھے ۔

مصر کے بادشاہوں اور کاہنوں کی داستان
سامرستانی حالات سے گو ملتی جلتی ہے لیکن بالکل
مماثل نہیں ہے ۔ سامرستان کے اولیں فرمانروا کاہن
تھے ، یا وہ کپتان یا سپہ سالار جنھوں نے کاہنوں
سے ساری قوت چھین کر اپنے دست قدرت میں
کر لی تھی ۔ لیکن مصر کے بادشاہ جو عام طور پر
فراعنہ کہلاتے تھے ، ہمیشہ کاہنوں پر حاوی رہے
چنانچہ مصر کی قدیم تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ فرمانروا
مصر کو کاہنوں سے کہیں زیادہ اہمیت اور اقتد

حاصل تھا۔ خانوادۂ فراعنہ کا ہر ایک فرمانروا خدا یا
کم از کم پیکر انسانی میں الوہیت کا حامل تصور کیا
جاتا تھا، جس کی برتری کا کاہنوں کو معترف
ہونا پڑتا۔

الغرض سامرستان اور مصر کی قدیم شہری مملکتوں
کے دو ممتاز طبقے، کاہنوں اور فرمانرواؤں کے
تھے۔ دانشمند بادشاہ کاہنوں کو ہمیشہ اپنا دست
و بازو بنا کر رکھنے کی سعی میں رہتے تھے۔ اِن
لوگوں سے عداوت مول لینا خطرے سے خالی نہ
تھا۔ اس لئے کہ یہ لوگ نہ صرف عوام کے قلب و
دماغ پر متسلط تھے، بلکہ بڑی بڑی جائدادوں کے
مالک بھی ہوا کرتے تھے۔ اور مصر میں تو مزروعہ
زمین کا تقریباً ایک تہائی حصہ معبد نشینوں ہی

کے قبضے میں تھا۔

ایک اور طبقہ بھی تھا جس کو بادشاہ ناخوش رکھنا نہ چاہتے تھے۔ یہ طبقہ تھا اُمرا کا جس میں بڑے بڑے زمین دار، دولت مند، تاجر، ساہوکار اور بالخصوص اعلیٰ عہدہ دار شامل تھے۔ یہ لوگ بڑے مقتدر ہوتے تھے۔ بادشاہ ان لوگوں کے ساتھ اچھے روابط قائم رکھنے میں ناکام ہوتا، تو یہ لوگ کھلے میدان بغاوت یا ہنگامہ برپا کر دیتے اور موقع پاتے تو خود بادشاہ کو تخت و تاج سے محروم کرنے میں بھی کمی نہ کرتے۔

متذکرہ بالا دو طبقوں کے علاوہ، تین اور طبقے تھے جن کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے — یعنی پیشہ ور، مزدور و کاشتکار، اور غلام۔

پیشہ ور یا اوسط طبقے کی ذیل میں اطّبا، قانون گو، اور محرر شامل تھے۔ گو یہ لوگ کم حیثیت تصوّر کئے جاتے تھے، تاہم ترقی کرنے کے لئے ان لوگوں کو مواقع حاصل تھے۔ دولت مند ہونے پر یہ لوگ معیّد نشین طبقے کے زمرے میں داخل ہونے، یا طبقۂ اُمرا کے رتبۂ بلند تک پہنچنے کی توقع کر سکتے تھے۔

اس قسم کی کوئی توقع غریب مزدور کی دلدہی کا باعث نہ ہوتی تھی۔ تہیدستی اور مسلسل عرقریزی اُس کے مقسوم میں تھی۔ کسانوں کی حالت مزدور طبقے سے کچھ بہتر نہ تھی۔ اگر ایک طرف بے چارہ مزدور اپنی عرق ریزیوں کا معاوضہ اس قدر کم پاتا تھا کہ اپنے اہل و عیال اور خود کو فاقے سے محفوظ رکھنا اُس کے لئے بے حد

دشوار تھا، تو دوسری طرف غریب کسان اپنے کھیت کا کثیر محصول ادا کرنے کے بعد بڑی مشکل سے اپنی گزران کر سکتا تھا۔

غلاموں کی حالت اور بھی قابلِ رحم تھی۔ بڑی بد بختی تو یہ کہ وہ اسیرانِ جنگ ہوتے تھے جنھیں اپنے آقاؤں کی خدمت میں تمام زندگی بسر کرنا پڑتی۔ بسا اوقات بادشاہ بڑی بڑی فوجی مہم پہ محض غلاموں کو اکٹھا کرنے کی نیت سے جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسے لوگ بھی جو قرض کی ادائی سے قاصر رہتے، اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے اور غلام بنا لئے جاتے تھے۔ مجرم بھی غلاموں کے زمرے میں داخل ہونے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

غلام کے ساتھ برتاؤ کا انحصار آقا کی مرضی اور مزاج پر موقوف تھا۔ ایک ظالم اور بے رحم آقا اپنے غلام کا جینا دو بھر کر دیتا تھا۔ بے چارے غلاموں کے سر دُنیا بھر کا بکھیڑا لگا دیا جاتا تھا۔ بوسیدہ تالابوں کی مرمت، نہروں کی کھدائی، معابد اور قصور کی تعمیر، ملّاحی اور کشتی بانی، گھر بار کا سارا کام، انھیں بے زبانوں کے سپرد تھا۔
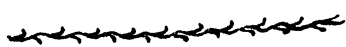
باب گیارہواں

سامرتنان و مصر

(علوم وفنون، اور کاروباری زندگی)

مصریوں کی دولت، اُن کی صناعی، اور ذوقِ
تعمیر کی شان خصوصیت کے ساتھ بادشاہوں کے
مقبروں اور دیوتاؤں کے معابد سے آشکارا ہوتی ہے
سنگیں تعمیری کا ذوق سب سے پہلے مصر
میں پیدا ہوا۔ مصر کے اہرام جن کی ازمنۂ
بعید میں کہیں نظیر نہیں ملتی، اس ذوق کا مجسم
نمونہ ہیں۔ مصریوں ہی نے سب سے پہلے اپنے

مصری معبد کے هال کا ایک حصہ

مصری عمارتون میں وسیع هال اور بلند چھتون کا بار سنبھالنے کے لئے قطار در قطار ستون ہوا کرتے تھے
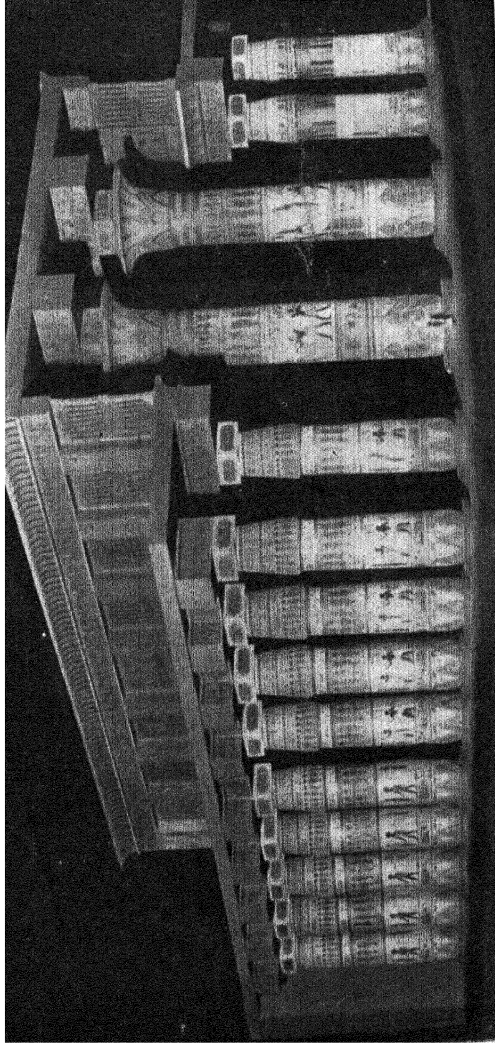
عمارتوں کے ذریعے جن میں وسیع ہال اور بلند
چھتوں کا بار سنبھالنے کے لئے قطار در قطار ستون
ہوا کرتے تھے، آنے والی نسلوں کو ایک نئے طرزِ
تعمیر سے روشناس کرایا۔ چنانچہ مصریوں کے یہ
تعمیری گُر بعد کو یونانی اور رومائی معماروں نے اخذ
کر لئے اور انھیں لوگوں کی بدولت یہ چیز یورپ
کے باقی ماندہ حصوں میں پھیل گئی۔ اب بھی مصری
عمارات کے آثار سے اِن عمارتوں کی جسامت،
استحکام، اور جلال کا دیکھنے والے کے دل پر
ایک خاص اثر پڑتا ہے۔

سامریوں کا فنِ تعمیر، عام طور پر عالیشان
معابد پر صرف ہوتا تھا۔ لیکن اُن کی عمارتیں
چونکہ خام اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں، اِس

لئے اُن میں مصری عمارتوں کی پائداری اور استحکام مفقود تھا۔ ہر ایک سامری معبد کی عمارت بلند مربع مینار سے مشابہ ہوتی تھی، جس کی بالعموم سات منزلیں ہوا کرتی تھیں۔ بالا ترین منزل پر خاص مندر یا وہ مقام ہوا کرتا جہاں دیوتاؤں کی مورتیں رکھی جاتی تھیں۔ سامریوں کے ہاں کمان اور کمانہ دار چھت بنانے کا طریقہ بھی رائج تھا۔ مغرب والوں نے یہ چیز سامریوں ہی سے سیکھی۔

مصر اور سامرستان میں مجسمہ سازی اور نقش گری کا فن بھی عام تھا۔ لیکن اُن کے بعض تخلیقی نمونوں سے بد وضعی اور کھُردا پن ظاہر ہوتا ہے جس سے ہمارا موجودہ ذوق لذّت گیر نہیں ہوتا۔ تاہم بعض نمونے ایسے بھی ملیں گے

سامری معبد
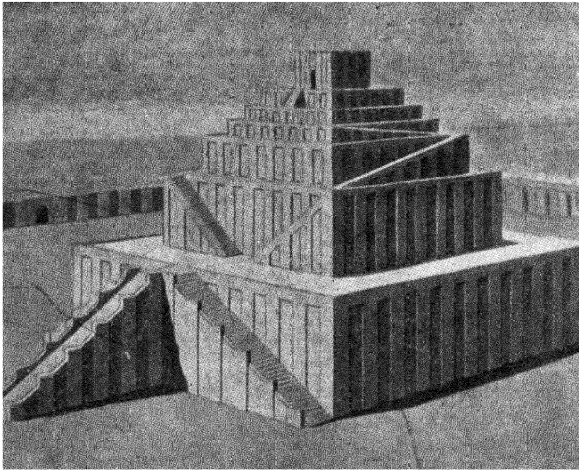
یہ عمارت بلند مربع مینار سے مشابہ ہوتی تھی
جس کی بالعموم سات منزلیں ہوا کرتی تھیں

ایک اور سامری معبد
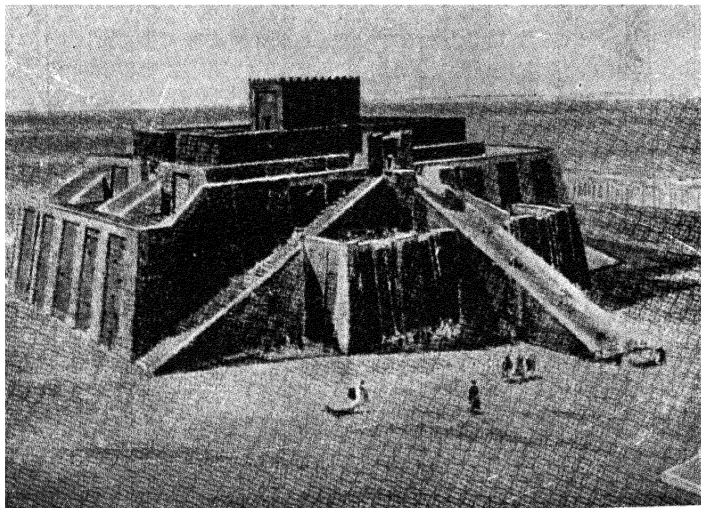
جو فنکارانہ حیثیت سے مستحقِ ستائش ہیں۔ مصر
میں مجسمہ سازی کے لئے کاٹنے، سنگلاخ، تانبے
اور سنگ آہک سے کام لیا جاتا تھا، اور سامرستان
میں چکنی مٹی، سنگ آہک اور بعض اوقات
سنگ مرمر سے۔

مصری اور سامری نقاشی اپنی خامیوں اور
رسمی پابندیوں کے باوجود، فنکارانہ خوبیوں کی
حامل تھی۔ فنّی تفصیل کے معاملے میں وہ،
صداقت سے کسی قدر ہٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس
کی تلافی منحنی خطوط کے ذریعے کردی جاتی تھی،
جن کا خماؤ بے حد دل کش ہوتا تھا۔ بیشتر خاکوں
سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نقاش تعیّنِ فاصلہ
کے تعقل سے بے بہرہ تھا۔ کوئی ایک شے جب

کو کسی دوسری کے عقب میں ظاہر کرنا مقصود ہوتا، محض اُس شے کے اوپر دھری ہوئی دکھائی جاتی تھی۔ شبیہہ انسانی کے خاکے نیم رُخ ہوا کرتے تھے، اور دونوں شانے یا کندھے لبا اوقات اس طرح نمایاں کئے جاتے تھے جیسا کہ مستقبل تصاویر میں ہوا کرتا ہے۔ روشنی اور عکس کا امتیازی فرق بھی اُن کے ہاں معدوم تھا۔

مصری اور سامری بلاد میں شیشہ گروں، کمہاروں جلاہوں، نجاروں، لوہاروں و نیز چاندی سونے اور ہاتھی دانت کے کاریگروں کی کمی نہ تھی۔ ان قدیم کاریگروں کی دستکاری سے اُن کے کمالِ بےپایاں کا پتہ لگتا ہے۔ مصری سوتی پارچے بہت مہین اور دیدہ زیب ہوتے تھے۔ مصری شیشے جن پہ خطوطِ

رنگا رنگ کی تحریر ہوتی تھی، بے حد مقبول اور گراں قیمت ہوا کرتے تھے۔ سامری نقشی پردے، قالین، اور کمل اپنی طرحداری، خوش وضعی، اور رنگ کاری میں عدیم النظیر ہوتے تھے۔

علوم ریاضی میں بھی مصریوں اور سامریوں نے نمایاں ترقی کی تھی۔ مصر کی اعلیٰ حساب دانی کا ایک نہایت قدیم مخطوطے سے پتہ لگتا ہے جس میں اناج گھروں کی وسعت، نیز کھیتوں کے رقبے کا حساب جوڑنے کے لئے ہندسی نظریئے اور حسابی سوالات کسور اور صحیح اعداد کی صراحت کے ساتھ تفصیل وار درج ہیں۔ اسی طرح ایک سامری حساب جدول میں مربع اور مکعب کے ایک سے ساٹھ تک کے پہاڑے نہایت

صحت کے ساتھ لکھے موجود ہیں۔ جملہ حساب و شمار کا انحصار بارہویں عدد پر ہوا کرتا تھا۔ درجوں منٹوں، اور لمحوں (۳۶۰°، ۶۰'، ۶۰") میں دائرہ کی تقسیم کا طریقہ بھی اسی اثنا عشاری نظام پر دلالت کرتا ہے۔

علم ہیئت میں بھی مصریوں نے مہتم بالشان ترقی کی تھی۔ قدیم مصریوں نے ہلالی مہینوں کو خارج از حساب کر کے شمسی مہینوں کی جنتری مرتب کی تھی جس میں تیس دن کے بارہ مہینے ہوتے تھے، اور ختمِ سال پر مزید پانچ یوم کا اضافہ کیا جاتا تھا۔ سامریوں کے ہاں آفتاب کے، بارہ بروج سے گزرنے کا باقاعدہ حساب ہوا کرتا تھا۔ سیّاروں میں سے پانچ کے

متعلق اُنھیں وقوف تھا اور اپنی پکّی حساب دانی کی بدولت چاند اور سورج گرہن کے متعلق پیشین گوئی بھی کرتے تھے۔

مصریوں اور سامریوں نے فنِ طِب کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ وہ، مختلف امراض کے اسباب و علامات کی تشخیص پر قدرت رکھتے تھے، اور اُن کے ہاں طبیبوں اور جرّاحوں کی کمی نہ تھی۔ تاہم اُن کی طِب میں سِحر کو بہت دخل تھا جس طرح کہ اُن کے علمِ فلکیات میں نجوم کا عنصر غالب تھا۔

تعمیر کاری، مجسمہ سازی، پیشہ ورانہ فنون اور مختلف علوم کی ترقی کے ساتھ، تاجروں میں تجارتی اشیاء کے فراہم کرنے اور اُن مقامات پر جہاں

خرید و فروخت کا امکان تھا، ان اشیاء کو
بہ پیمانۂ کبیر منتقل کرنے کا خیال بھی دامن گیر ہوا۔
چنانچہ اس کی بدولت بعض سامری بلاد کو خاص
طور پر کاروباری منڈیوں کی اہمیت حاصل ہوگئی۔
شراکت اور حصہ داری عام تھی تجارتی کمپنیوں
کے قیام کا بھی ہمیں پتہ لگتا ہے، جن کی ہیئتِ
ترکیبی موجودہ کاروباری اداروں سے مماثلت رکھتی
تھی۔ سامری شہروں کی بیوپاری سرگرمیوں کو دیکھ
کر، عہدِ جدید کی کاروباری زندگی کا نقشہ آنکھوں
کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

پہلے پہل چھلّوں اور چھڑ کی شکل میں فلزّی
زر کی ابتدا ہوئی۔ سکّوں کی اہمیت کا احساس
بعد کو پیدا ہوا۔ مصریوں نے چھوٹے چھوٹے

طلائی سکّے رائج کئے جو طلار البقر کہلاتے تھے۔ ہر ایک طلائی سکّہ ایک گائے کی قیمت کے برابر ہوا کرتا تھا۔ لین دین کے موقع پر ان سکّوں کا وزن کر لینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بعد کو ہر سکّے پر اس کے حقیقی وزن اور قیمت کے اندراج کا طریقہ بھی عام ہو گیا۔ سامرستان میں نقرئی سکّوں کا رواج تھا جن کو شیکل کہتے تھے۔

مصرفِ زر نے جس کی بدولت لین دین کے معاملات میں بے انتہا سہولت پیدا ہو گئی تھی، بنک اور بنکی کار و بار کے قیام کی جانب رہنمائی کی۔ سامرستان میں ایک بڑا بنک گھر تھا جس کے کار و بار اور بیوپار کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ اربابِ علم نے اس بنک کے سیکڑوں تمسکات،

بڑے بڑے سفالیں مرتبانوں سے برآمد کئے ہیں
جن سے اس زمانے میں تجوریوں کا کام لیا جاتا تھا۔
سامری معبدوں میں بھی رقوم کو امانتاً جمع کرنے
اور قرض پر اُٹھانے کا طریقہ رائج تھا۔ سامری
کاروبار اور عطائے قرض کے طریقے بعد کو ایشیائے
کوچک، اور وہاں سے یونان، اور یونان سے بہ تدریج
دیگر ممالک مغرب میں پھیل گئے۔

باب بارہواں

سامرستان و مصر

(قوانین، اور اقتدار شاہی)

کاروباری زندگی کی نشو و نما کے لئے منجملہ اور امور کے اندرونی بندوبست اور امن و اماں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مصر اور سامرستان کی اولیں مملکتیں اندرونی عافیتوں سے مالا مال تھیں، اور ان دونوں ممالک میں باشندوں کی جائداد، اُن کے حقوق، و نیز پیشہ وروں کے پیشے کی نگہداشت کا خاصہ اہتمام تھا۔

مصر میں قیام امن کے لئے عدالتیں
تھیں، اور معاہدوں، قرضہ جات، رہن، حصّہ
مناکحت، اور خاندانی امور کے باب میں صاف
صریح ضابطے اور قوانین موجود تھے۔ عورت
کا پوزیشن خاص طور پر مُرتفع تھا۔ اُس
ملکیت اور توارث کے معاملے میں کامل آزا
اور اختیارات حاصل تھے، اور کسی معاملے
قانونی معاہدے میں وہ اپنے طور پر شریک ہ
کی مجاز تھی۔

تعدّد ازدواج کا طریقہ صرف اونچے طبقہ
کی حد تک رائج تھا۔ عام طور پر عورت، مر
کی خادمہ نہیں بلکہ برابر کی شریک سمجھی جاتی
والدین کی اطاعت و احترام کے مسئلہ پر سخت

سے عمل در آمد تھا۔ اور مصریوں کے نزدیک والدین کا شمار اعلیٰ ترین نیکیوں میں ہوتا تھا۔

سامری باشندوں کی قانون پسندی مصریوں سے کچھ کم نہ تھی۔ جب کبھی کوئی شخص غلام یا غلّے کی خرید و فروخت کرتا، جورو بیاہتا، یا مرتے دم وصیت کرتا تھا، تو عام طور پر اس طرح کے جملہ معاہدات کا اندراج معاہداتی تختیوں پر ہوا کرتا تھا جو تکمیلِ عہد کے بعد محافظ خانوں میں منتقل کر دی جاتی تھیں، اور جن پر مزید حفاظت کی خاطر خاص قسم کے غلاف چڑھائے جاتے تھے۔ ان تختیوں پر نام تحریر کرنے کے بجائے، سامری باشندہ اپنی مُہر ثبت کیا کرتا تھا۔ اس طرح ہر صاحبِ املاک کے لئے اپنی ذاتی مُہر کا رکھنا ضروری تھا۔

عدل و انصاف کے معاملے میں سامریوں کو یلا کا درک حاصل تھا۔ لیکن اُن کے نظامِ قانون کے چند فرسودہ پہلو بھی تھے، مثلاً سزا کے باب میں انتقام کا وہ بھونڈا طریقہ جس کے رُو سے آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت نکال لئے جاتے، یا باپ کو مارنے کے جرم میں بیٹے کے ہاتھ قلم کر دئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ، سزا کی نوعیت کا انحصار بالعموم خاطی کی حیثیت پر ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کی آنکھ کو ضرب شدید پہنچانے کا باعث ہوتا تو مجرم کو اس خطا کی پاداش میں اپنی آنکھ نذر کرنا پڑتی۔ لیکن اگر یہی ایذا امیر کی بدولت کسی غریب کو پہنچتی تو مجرم سے صرف جرمانہ وصول کیا

جاتا تھا۔ قانون کی نظروں میں امیر اور غریب کا امتیاز تھا۔

اس امتیاز کی وجہ صاف ہے۔ عوام کو اُمورِ حکومت میں رائے دہندگی یا وضع قوانین کا نہ تو حق حاصل تھا، اور نہ اُنھوں نے اس کے حصول کی کبھی کوشش کی۔ جمہوریت اور مساوات کے مفہوم سے وہ ہنوز نا آشنا تھے۔ بادشاہ سے منحرف ہونے کا خیال بھی اُن کے ذہن میں پیدا نہ ہو سکتا تھا، اس لئے کہ وہ اپنے بادشاہ کو خدا کا نائب تصوّر کرتے تھے، اور اس نائب خدا کے لئے غریب و امیر کے فی مابین حدِ فاصل قائم کرنا اپنے جلبِ منفعت اور قیام اقتدار کے لئے ناگزیر تھا۔

بہر حال بادشاہ کی الوہیت کے اعتقاد کی بدولت

رعایا پر اپنے بادشاہوں کی فرماں بری داخلِ فرض تصور کی جاتی تھی۔ وہ، ایک علی الاطلاق حاکم ہوتا تھا جس کی حکومت جملہ قیود سے آزاد، اور جس کی ذات تمام ذمہ داریوں سے مرتفع سمجھی جاتی تھی۔

بادشاہ کے فرائض متعدد تھے، اور اُس کی ذات سے کئی عہدے وابستہ ہوتے تھے۔ وہ، عدالت کا حاکم، فوج کا سپہ سالار، اور معابد کا پیشوا ہوتا تھا۔ لڑائی کے موقع پر فوجوں کی رہبری اور میدانِ وغا کے خطرات کا سامنا کرتا، اور امن و صلح کے زمانے میں معابدی قربانیوں، اور مذہبی جلوسوں میں سرگرم رہتا تھا۔ وقتاً فوقتاً درباریوں کو بھی باریابی کا موقع دیتا، اُن کی شکایتوں کو سنتا،

جھگڑے چکاتا، اور احکام نافذ کرتا تھا۔

ان بادشاہوں کے دربار بڑے پُر تکلف ہوتے تھے۔ سفر کی حالت میں بھی جبکہ کوئی بادشاہ کسی مہم پر جاتا، تو قیمتی ساز و سامان، سونے چاندی کے ظروف، اور پُر تکلف لباس کا اپنے ہمراہ رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کی ہمرکابی میں سینکڑوں خدام، محافظ، اور عہدہ داروں کا ایک جمِ غفیر ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ کے مواجہ میں پہنچکر سجدہ کرنا یا زمین بوس ہونا، ہر شخص کے لئے ضروری تھا۔

بادشاہوں کے بارے میں یہ اعتقاد کہ وہ دیوتاؤں کے فرزند اور نائب ہیں، و نیز اس قبیل کے متعدد توہمات کا رواج اس لئے عام تھا کہ علم کی برکتوں سے صرف ایک محدود طبقہ متمتع ہوتا تھا۔ مدارس

اور کتب خانوں تک عوام کی رسائی ناممکن تھی۔ مروّجہ قاعدے کے رُو سے صرف خوش حال لوگ تعلیم و تعلم کے اہل تصور کئے جاتے تھے۔ عام طبقے کے افراد جاہل ہی رہتے تھے۔ اُن کی یہ جہالت اُنھیں ازمنۂ ماضیہ کی ذہنی غلامیوں سے رہا نہ کر سکتی تھی۔ قدیم توہمات کا ترک کرنا اور نئے اثرات کا قبول کرنا اُن کے لئے بے حد دشوار تھا۔ عمومی تعلیم کے فقدان نے سامریوں اور مصریوں کو ترقی کی بہت ساری برکتوں سے محروم رکھا۔

ترقیٔ تمدن کی راہ میں ایک اور چیز جو خاص طور پہ مزاحم ہوئی وہ 'شہری مملکتوں کے باہمی جھگڑے اور تباہ کُن بیرونی معرکے تھے لیکن ان معرکوں اور لڑائیوں کا احوال بیان کرنے سے پہلے، اُن

آوارہ گرد قبائل کا اجمالی ذکر ضروری معلوم ہوتا
ہے جو اکثر جنگ و جدال کے بعد شہری مملکتوں
میں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اُن بحر پیماؤں
کا بھی ذکر ہو گا جن کے اپنے قائم کردہ شہر موجود
تھے، اور جن کی تجارت اور کار و بار کا اثر سامرستان
اور مصر پر بھی پڑا۔
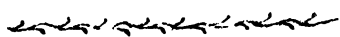
باب تیرہواں

قدیم آوارہ گرد

عین اُس زمانے میں جبکہ ایک طرف زراعت پیشہ انسانوں کے اولین تمدن رُو بہ ترقی تھے، دوسری طرف ایک جداگانہ معاشرت، یعنی خانہ بدوشانہ زندگی کا دَور دَورہ تھا۔ یہ خانہ بدوش آوارہ گرد اپنے سکونت پذیر ہم جنسوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور جفاکش تھے۔ اُن میں کا ہر فرد نسبتاً زیادہ خود اعتماد، اور انفرادیت پسند ہوتا تھا۔ اُن کے ہاں کاہنوں اور طبیبوں کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ البتہ سرگروہ بڑی

قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے کہ اُس کی فراست، پامردی، اور قیادت پر ایک بے خانماں قبیلے کی عافیت و بقا کا بڑی حد تک انحصار تھا۔

آوارہ گردی کو مرحلۂ اقامت گزینی کا پیش خیمہ تصور کرنا قرین صحت نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ کم و بیش سب ہی انسان ابتداءً تلاش غذا میں نقل مقام کیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ بعضے تو زرخیز و شاداب اقطاع میں زمین گیر ہو گئے، اور بعضوں نے اپنا قدیم نہج زندگی بدستور قائم رکھا اور اسی میں اپنے آرام و آسائش کا سامان مہیا کرلیا۔

اِن دو گونہ اوضاع زندگی کا باہمی تصادم

ناگزیر تھا۔ قدیم آوارہ گرد، چراگاہوں کی تلاش میں اپنے مویشیوں کے ساتھ دُور دُور چکر لگاتے، اور اس دوران میں کہیں مزروعہ زمین یا آبادی نظر آجاتی تو اُس کے قریب پڑاؤ ڈالتے، اور یہ اقتضائے مصلحت چوری یا لوٹ مار سے کام لیتے۔ بعض اوقات لین دین بھی ہوا کرتا۔ اپنے ہمراہ چمڑے، دھاتی اشیاء وغیرہ لاتے، اور ان کے عوض کپڑے، برتن بھانڈے، اور دوسری صنعتی چیزیں لے جاتے تھے۔

آوارہ گرد عام طور پر شہریوں کو بودے، کم ہمت اور بزدل خیال کرتے، اور شہری باشندے آوارہ گردوں کو گنوار، سخت دل، اور وحشی سمجھتے اور اُن کے حملوں اور لوٹ مار سے بے حد خائف

اور متوحش رہتے تھے۔

لیکن ان حملوں کے اثرات بالعموم دیر پا نہ ہوتے تھے، اس لئے کہ سرحدی ڈکیتی اور لوٹ مار سے زیادہ ان کی اہمیت نہ تھی۔ سکونت پذیر آبادیوں کی تعداد کثیر کے آگے آوارہ گرد عموماً غارت گرانہ دستبرد اور مال و متاع لوٹ لے جانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ شہروں پر اپنا تسلط جما کر اپنی منظم حکومت قایم کرنا ان کے لئے عملاً ناممکن تھا۔

اس کے باوجود کبھی یہ بھی ہوا کرتا تھا کہ ان آوارہ گردوں میں کوئی سرگردہ ایسا بھی پیدا ہوجاتا جو اپنی وجاہت اور ذاتی اثر سے اپنے ونیز گرد و نواح کے دوسرے قبائل کو منظم کرکے ان میں

اتفاق اور یک جہتی کی روح پھونک دیتا۔ پھر تو آس پاس کی آبادیوں کی خیر نہ ہوتی، اور قتل و غارت کا ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ لیکن سابقہ دستور کے مطابق محض مال غنیمت پر اکتفا کرنے کے بجائے، فاتحوں کا ٹڈی دَل شکست خوردہ علاقے پر متصرف ہو جاتا، اور تمام ملک سرتاسر مال غنیمت محسوب ہونے لگتا۔ دیہاتوں اور شہروں کے بے بس باشندے غلامی اور ماتحتی کی زنجیروں میں جکڑ دئیے جاتے، اور آوارہ گرد گلہ بانوں کے سردار اُن پر راج کرتے، اور ملک کے بادشاہ، شہزادے اور امیر بن بیٹھتے۔

اہلِ ملک دولت پیدا کرتے اور یہ اس سے متمتع ہوتے۔ اس طرح، محنت مزدوری کرنے والی

رعایا اور محنت مزدوری نہ کرنے والے حکام کے درمیان شدّت کے ساتھ تفاضُل نمایاں ہونے لگتا۔ رفتہ رفتہ یہ نو وارد حکام تن آسانیوں کا شکار ہو جاتے اور شہری زندگی کے تعیشات اختیار کرلیتے۔ مفتوح تمدن اپنے فاتحوں کو جب اس طرح مغلوب کر لیتا، تو کسی بیرونی قوت کی از سرِ نَو لشکر آرائی شروع ہو جاتی۔

یہ ہے وہ افسانہ جس کو تاریخ عالم سات ہزار سال سے، تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ دہراتی چلی آ رہی ہے۔ آیندہ ابواب میں ہم اس افسانے کے صرف اُن حصوں پر جن کا تمدن عتیق سے تعلق ہے تا بہ مقدور روشنی ڈالیں گے۔ فی الحال ہم آوارہ گردوں کے بعض سر برآوردہ قبائل کے

محض نام گنوانے پر اکتفا کریں گے۔

قدیم آوارہ گرد انسان پانچ بڑے گروہوں میں منقسم، اور تین بڑے اقطاع زمین پر متصرف تھے۔ (ا) ایک تو وہ جن کا آریاؤں سے نسلی تعلق تھا اور جو تمدنی الجھیڑوں سے دور، یورپ کے جنگلوں میں مگن تھے۔ (ب) دوسرے وہ جن کا نسلی رشتہ منگولیوں سے ملتا تھا، اور جنھوں نے بہت ممکن ہے کہ چین کے رود وادی تمدن پر چھاپہ مارا ہو۔ (ج) تیسرے وہ حبشی نژاد باشندے جو عیلامی کہلاتے تھے، اور جو سامرستان کے مشرق جانب بس گئے تھے۔ (د) چوتھے وہ سامی الاصل جو دریائے دجلہ اور بحیرۂ روم کے درمیان مختلف علاقوں میں رفتہ رفتہ آباد ہوگئے

تھے، اور جن میں عکادی، عامری، اشوری، آرامی یا شامی، فنیقی، کنعانی، کلدانی اور عبرانی یا اسرائیلی خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

(۵) پانچویں وہ لوگ جو قسطی، میتانی، اور حبشی کہلاتے تھے جن کے نسلی تعلق کے بارے میں ہمارے پاس اطلاعات نہیں ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سامیوں کے اکثر ذیلی گروہ جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا، آپس میں قبائلی رشتہ رکھتے تھے اور ان سب کا مولدِ اصلی جنوبی حجاز تھا جہاں سے نکل کر نئے اقطاع کی جستجو میں وہ شمال کی جانب بڑھے۔

باب چودہواں

اولیں بحر پیما
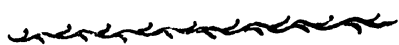
زرعی اور خانہ بدوشانہ اوضاع زندگی کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے نہج کی زندگی، یعنی بحرپیمائی بھی رُو بہ ترقی تھی۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ تالابوں اور دریاؤں کے قرب و جوار میں رہنے والے جدید عصر الحجری انسان، ملاّحی اور کشتی سازی سے نابلد نہ تھے۔ لیکن ان لوگوں کو اولیں بحرپیما تصور کرنا زیادتی ہوگی، اس لئے کہ ابتدار میں اُن کی کشتیاں بڑی بے ڈھنگی، کمزور، اور تلاطم خیز سمندر

پر چلانے کے قابل نہ تھیں۔ ماہی گیری، یا ندی نالوں اور جھیلوں کو عبور کرنے کے سوا ان کشتیوں کا اور کوئی مصرف نہ تھا۔

یہ کشتیاں کُندوں اور درختوں کے مجوف تنوں سے بنائی جاتی تھیں۔ بعض مقامات پر جہاں کارآمد لکڑی دستیاب نہ ہوتی، مشکیزہ کشتیوں اور چمڑے کے ڈونگوں کا رواج عام تھا۔ ٹوکروں پر چمڑا مڑھ کر بھی کشتیاں بنائی جاتی تھیں، جیسا کہ مصر اور سامرستان میں ہوا کرتا تھا۔

لیکن اِن دونوں ممالک کے باشندوں نے کشتی سازی کے فن میں نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی اور دیگر فنون کی طرح، کشتی اور جہاز سازی کے معاملے میں بھی اُنھیں اوّلیت کا شرف حاصل

ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ جدید عصر الحجری مراحل
سے عہدہ برآ ہونے کے قبل ہی مصریوں کے ہاں
جہاز رانی ہوا کرتی تھی، اور اُن کے بعض جہاز اتنے
بڑے ہوتے تھے کہ اُن پر ہاتھی بہ آسانی پار کئے
جا سکتے تھے۔ مصری جہازوں کی نہ صرف رود نیل
بلکہ بحیرۂ روم اور بحر قلزم میں بھی آمد و رفت رہا
کرتی تھی۔ علیٰ ہذا اب سے کوئی نو ہزار سال پہلے
سامریوں کی بندرگاہ ایرید و کے جہازات خلیج فارس
اور بحیرۂ عرب میں چلا کرتے تھے۔ اغلب ہے کہ
اسی زمانے سے سامریوں اور ہندوستانیوں میں تاجرانہ
روابط قائم ہو گئے تھے۔

جہاز رانی کی ترقی کے ساتھ وسائل آمد و رفت
اور قیامِ نو آبادیات کی راہ میں ایک نئے باب کا

اضافہ ہوا، جس کی بدولت انسانی معلومات، تہذیب، اور تجارت کی توسیع میں مزید آسانیاں پیدا ہوگئیں۔

مصریوں اور سامریوں کے بعد جنھوں نے بحر پیمائی میں فروغ حاصل کیا وہ، جزائر ایجین کے باشندے تھے۔ یہ لوگ اور مقامات، مثلاً قبرص، یونان، ساحل ایشیائے کوچک، صقلیہ اور اطالیہ کے جنوبی حصے پر آباد تھے۔ ان ایجینیوں کے نسلی تعلق کے باب میں ہمارے پاس معتبر اطلاعات نہیں ہیں۔ یہ بتانا بھی دشوار ہے کہ مذکورہ مقامات پر یہ لوگ کب اور کس طرح آباد ہوئے۔ ایجینی تمدن کے بارے میں بھی جو کچھ اطلاعات ہمیں میسّر ہیں، اُن کا بیشتر حصہ قرلطیہ کے ایک شہر ناسوس کے برآمد شدہ آثار پر مبنی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے پیش کردہ نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ قریطیوں نے منجملہ اور چیزوں کے مصریوں سے جہاز سازی اور جہاز رانی کے طریقے سیکھے، نیز یہ کہ اب سے کوئی چھ ہزار سال قبل بحر پیمائی میں عبور حاصل کر لیا اور مصریوں کے ساتھ تجارتی سرگرمیاں شروع کر دیں۔

لیکن قریطیوں کی اقبال مندی اور مرفہ الحالی کا ستارہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد چمکتا ہے جبکہ یہ لوگ ایک فرمانروا کی قیادت میں متحد اور یکجہت ہو گئے۔ قریطی فرمانروا میناس کہلاتے تھے۔ اسی مناسبت کی بنا پر ایجیئنی یا قریطی تمدن کو میناسی تمدن بھی کہتے ہیں۔

قریطی تمدن اپنے ہم عصر تمدنوں سے کسی

قدیم قریطی بادشاہون کی تخت گاہ

طی فرمانروان کے محل اپنی خوبصورتی اور فنکارانہ طرح اندازی میں دنیائے قدیم کی عمارات کے ہم پلہ

طرح کم حیثیت نہ تھا۔ قرطبی فرمانرواؤں کے محل اپنی جلالت، خوبصورتی، اور فن کارانہ طرح اندازی میں دُنیائے قدیم کی عمارات کے ہم پلّہ تھے، اور ان میں حمام خانوں، نلوں اور دیگر اسباب آسائش و تزئین کی کمی نہ تھی۔

قرطبیوں کے کُمھاری برتن، سوتی پارچے، نقاشی اور مجسمہ سازی، دھاتی اشیاء، منقش جواہرات، اور ہاتھی دانت کے کام، انسانی صنعت گری کی اعلیٰ مثالوں میں محسوب ہوتے ہیں۔ اسی ضمن میں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُن کے ہاں عورتوں کا لباس عہدِ وکٹوریہ کی انگریز عورتوں کے لباس سے بہت قریبی مماثلت رکھتا تھا۔

عین اسُ زمانے میں جبکہ قرطبی تمدن کا ستارہ

اوج پر تھا، ایک دوسرے گروہ کے انسان سمندر کے منظرِ مواج پر نمودار ہوئے جو تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے پیش روؤں اور حریفوں پر بحر پیمائی اور تجارت میں سبقت لے گئے۔ یہ لوگ وہ سامی الاصل آوارہ گرد ہیں جو فنیقی کہلاتے تھے اور جو شام کے مغرب جانب، آباد ہو گئے تھے۔

لیکن یہ تنگ و مختصر ساحلی علاقہ جس پر فنیقی متصرف تھے، اپنے محدود زرعی وسائل کے باعث ان لوگوں کی روز افزوں آبادی کے لئے غیر مکتفی ثابت ہونے لگا، اس لئے انھوں نے مجبوراً بحری زندگی اختیار کی اور بندرگاہی شہروں کا ایک سلسلہ قائم کر کے، تجارتی کاروبار اور صنعت و حرفت

کو فروغ دینا شروع کیا۔ اِن بندرگاہوں میں نہایت معروف و ممتاز عیقرہ، طیرہ، اور صیدان تھے جن میں موخرالذکر دو بلاد اُس زمانے میں ساحل سے کچھ ہٹ کر دو علیحدہ جزیروں پر آباد تھے۔

فنیقی جہاز راں دور و دراز بحری سفر پر جایا کرتے تھے۔ بحرِ ہند سے لے کر بحر اوقیانوس تک اُن کے جہازوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ اُن کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ ایک مصری فرمانروا کی خواہش کی بنا پر اُن کے بعض بحر پیماؤں نے برِ اعظم افریقہ کے گرد بحری سفر اختیار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، اور مشرقی ساحل کا چکر لگاتے ہوئے راس اُمید سے گھوم کر آبنائے جبل الطارق کی راہ مصر داخل ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اِس

طویل سفر کی تکمیل میں اُنھیں تقریباً تین سال کا عرصہ لگا۔ ہر سال کے ختم پر کسی ساحلی مقام پر لنگر انداز ہوتے، اور تخم ریزی و نیز تیاریٔ فصل کے بعد سامان خورد و نوش سے لیس ہو کر آگے کا رُخ کرتے۔

بہر حال اپنے طویل بحری مخاطروں کی بدولت فنیقی لوگ ممالک غیر کی قدرتی پیداوار سے بے حد فائدہ حاصل کرتے تھے۔ ہسپانیہ سے لوہا، جست، چاندی اور ٹین لے آتے۔ ٹین جو کانسے کی تیاری کے لئے ناگزیر تھا، جزیرہ برطانیہ کے جنوب مغرب سے بھی فراہم کرتے تھے۔ افریقہ سے سونا، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت، سیلون سے تانبا، عربستان سے عطریات اور قیمتی گرم مسالے، جہازوں پر لاد

لاتے۔ ان تمام بیرونی اشیاء کی مشرقِ قریبہ میں بڑی کھپت ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ دوسری خام پیداوار کی خود فینیقیہ میں درآمد کی جاتی، جو صنعتی اشیاء میں منتقل کرنے کے بعد کثیر نفع پر غیر ممالک والوں کو فروخت کر دی جاتیں۔

فینیقی کارخانوں کے عمدہ قالین، کانچ کے ظروف، چاندی اور کانسے کے دیدہ زیب کام، اور خوش وضع ارغوانی پارچہ جات کی دُنیائے قدیم میں بڑی مانگ تھی۔

اپنی تجارت کے سلسلے میں فینیقیوں نے شمالی افریقہ جنوبی ہسپانیہ، اور جزیرہ صقلیہ میں اپنی ساحلی نو آبادیاں قائم کرلیں جو دراصل اُن کے تجارتی مرکز تھے۔

ان مراکز میں سے بعضوں نے بڑے شہروں کی اہمیت حاصل کرلی۔ چنانچہ فنیقیوں کی بعید ترین نو آبادیات میں ایک شہر قادس (Cadiz) تھا جو آج بھی یورپ کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے، اور جس کے نام سے فنیقی بحرپیماؤں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا قرطجینہ کی نو آبادی جس کو طیرہ کے مستعمروں نے اب سے کوئی تین ہزار سال پہلے قایم کیا تھا، چند صدیوں کے اندر ہی اندر بحیرہ روم کی ممتاز بحری اور تجارتی قوتوں میں محسوب ہونے لگی۔

باب پندرہواں

اولین قومی مملکت

(مصر)

پیوستہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ قدیم آوارہ گرد اُن باشندوں سے جو شہری مملکتوں میں آباد ہو گئے تھے، لین دین، بیوپار، یا بہ اقتضائے مصلحت لوٹ مار کیا کرتے یا بعض اوقات اُن کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر لیتے تھے۔ لیکن خوش بختی سے مصر اور سامرستان کسی آوارہ گرد یا مختلف النسل انسانوں کی دستبرد سے ایک زمانے تک محفوظ رہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ممالک میں

جنگ و جدال کا نام و نشان نہ تھا، کیونکہ ایک مصری شہر کا دوسرے مصری شہر کے خلاف اُٹھ کھڑا ہونا، یا ایک سامری مملکت کا دوسری سامری مملکت پر غلبہ پانے کی کوشش کرنا، عام دستور میں داخل تھا۔

مصریوں کے باہمی جھگڑے عموماً تقسیم آب پر ہوا کرتے تھے۔ ایک علاقے والے دریائے نیل کا پانی اتنی کثیر مقدار میں کاٹ لے جاتے کہ دوسرے علاقے میں کاشت کے لئے پانی کی قلت محسوس ہونے لگتی۔ اس زمانے میں کوئی ایسی مرکزی حکومت بھی نہ تھی جو ان جھگڑوں کو چکاتی اور تمام علاقوں میں مساوی تقسیم کا اہتمام کرتی۔

بہر کیف صدہا سال کی باہمی معرکہ آرائیوں

کے بعد اب سے تقریباً چھ ہزار سال قبل، مصر
کی شہری مملکتیں ایک دوسری میں ضم ہوتے ہوتے
دو قلمروؤں کی شکل میں نمودار ہوئیں ۔ ایک
شمالی، دوسری جنوبی ۔ پھر کوئی چھ سو سال بعد
جنوب کے ایک بادشاہ نے جس کا نام مِنِعس تھا،
شمال کو فتح کر کے پورے ملک پر اپنا تسلّط جما لیا
اور ایک قومی مملکت کی بنیاد ڈالی ۔ اسی بادشاہ
سے فراعنۂ مصر کے خانوادوں کی ابتدا ہوتی ہے ۔
پہلے دو خانوادے تقریباً چار سو سال تک
حکمراں رہے ۔ لیکن اُن کے کارناموں میں کوئی خاص
بات ذکر کے قابل نظر نہیں آتی بجز اس کے کہ مرکزی
حکومت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی
رہی جس کی بدولت اہلِ مصر زندگی کے مختلف شعبوں

میں ترقی کرتے رہے۔

مصر کی قومی مملکت کے اولین پایۂ تخت کے متعلق جو اطلاعات ہمدست ہوئی ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ منیس یا اُس کے جانشینوں میں سے کسی فرعون نے ایک قدیم شہر کی دوبارہ بنیاد ڈالی جو تیسرے خانوادے کے عہد میں دار الحکومت قرار دیا گیا، اور جو تاریخ میں ممفیس کے نام سے مشہور ہے۔

تیسرے خانوادے کی حکومت تقریباً اسّی سال تک رہی، لیکن اس قلیل عرصے میں فراعنی اقتدار نے بہت زور پکڑا۔ نیوبستان کے حبشی باشندوں کی جو وقتاً فوقتاً جنوبی مصر پر چھاپے مارتے تھے، کامل سرزنش کی گئی۔ جزیرہ نمائے سینا جہاں تانبے کی

متعدد کانیں تھیں، فراعنۂ مصر کے قبضے میں آگیا۔
دریائے نیل پر کشتیوں کا ایک بیڑا قائم کیا گیا، اور
مصری جہاز دیو دار لکڑی کی در آمد کے لئے فینیقیہ
روانہ کئے جانے لگے۔

تعمیر اہرام کے رواج کی ابتدا بھی تیسرے
خانوادے سے ہوتی ہے۔ لیکن وہ مشہور و معروف
اہرام جن کا ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے، چوتھے
خانوادے کے عہد میں تعمیر ہوئے۔

چوتھا خانوادہ کوئی ڈیڑھ سو سال تک برسرِ
اقتدار رہا۔ اس کے فراعنہ شان وشکوہ اور ظاہری
عظمت کے بڑے دلدادہ تھے۔ آنے والی نسلوں کو
اپنے نام سے روشناس کرنے کا اُنھیں زبردست
خبط تھا۔ اُن کی یادگار تین بڑے اہرام، اور ایک

ابوالہول نامی بت سے برقرار ہے جو جیزہ میں واقع ہیں۔ سب سے بڑے ہرم کا رقبہ کوئی تیرہ[۱۳] ایکڑ، بلندی تخمیناً چار سو پچاس فٹ، اور وزن تقریباً ساٹھ لاکھ ٹن ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ غلام اور بیگاری کوئی بیس سال تک عرق ریز رہے۔

انسانی محنت کے بے جا استحصال، اور قومی دولت کے بے ٹھاٹھ اسراف نے مصریوں کو تباہ حال کر دیا۔ تمام ملک اپنے نا عاقبت اندیش حکمرانوں کی بدولت مالی اور معاشی مشکلات میں مبتلا ہو گیا، اور رعایا کے دلوں میں اس خانوادے کی جانب سے نفرت و بیزاری کے جذبات پیدا ہو گئے ان حالات سے شہر حیلیپہ کے موروثی کاہنِ اعظم

نے فائدہ اُٹھایا، اور تختِ فراعنہ پر اپنا قبضہ جماکر پانچویں خانوادے کی بنیاد ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی مصر کی وزارتِ عظمیٰ ہمفیبہ کے صدر کاہن کے ہاتھ لگی، اور شاہی کی طرح وزارت اور صوبجات کی حکومت بھی موروثی قرار دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں ایک قسم کا جاگیری نظام قائم ہوگیا۔

اس کے بعد تقریباً تین سو سال یعنی پانچویں خانوادے سے نویں خانوادے تک فراعنۂ مصر کی مرکزی حکومت میں برابر انحطاط رونما ہوتا رہا۔ خاندانی اور موروثی شرفِ مناصب کے باعث صوبجات کے حکام امیر کبیر بن بیٹھے اور اپنے اقتدار کو اور بھی مستحکم کر لیا۔ اُن کے ہاں اپنی آزاد عدالتیں، حکام، خزانے بیڑے، اور لشکر ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر خود کو

ایک چھوٹا سا بادشاہ یا رئیس گِننے لگے۔ ملک میں اُمرا کے باہمی مناقشوں اور خانہ جنگیوں کا ایک تانتا بندھ گیا بعضوں کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ وہ بادشاہ سے علی الاعلان متصادم ہونے لگے۔

بالآخر کار اُمرا کے ایک گروہ نے اپنے گرد و نواح میں امن و اماں قائم کر کے شہر ہرقولیہ میں ایک خانوادے کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ نواں اور دسواں خانوادہ انھیں ہرقولیوں کا قائم کردہ سلسلہ تھا جس نے کم و بیش اسّی سال تک حکمرانی کی۔

اس کے بعد مرکز حکومت شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہوا۔ شہر تھیبیہ کے با اثر اُمرا نے ہرقولیوں سے منحرف ہو کر کئی ایک خوں ریز معرکوں کے بعد گیارہواں خانوادہ قائم کیا، اور تھیبیہ کو جو اب تک

ایک غیر معروف مقام تصور کیا جاتا تھا دارالحکومت کی اہمیت حاصل ہو گئی۔ گیارہویں خانوادے کی تقریباً ڈیڑھ سو سال، اور بارہویں کی دو سو سال تک حکومت رہی۔

بارہویں خانوادے میں اُمرا کی قوت اور نظام جاگیر کا خاتمہ ہو گیا۔ فراعنہ کے اقتدار کا ستارہ پھر چمکا اور وہ تمام مصر کے علی الاطلاق فرمانروا تسلیم کئے جانے لگے۔ ملک میں پھر مرفہ الحالی کا دور شروع ہوا۔ فلاحت اور آبپاشی میں زبردست توسیع عمل میں آئی۔ اہرام اور معابد تعمیر کئے گئے۔ مختلف فنون، اور بالخصوص مجسّمہ سازی کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

لیکن مصر کی بدقسمتی سے اس خانوادے کا دوٗ

لمزور فرماں رواؤں پر خاتمہ ہوا' اور تیرہویں خانوادے
میں شاہی ٹوٹ کر شمال و جنوب میں منقسم ہو گئی۔
داخلی مناقشات اور خانہ جنگیاں ازسرِ نو برپا ہوئیں
اور طوائف الملوکی کا ایک دوسرا دَور ملک میں عام
ہوا۔ اسی زمانے میں شمال کے ایک فرمانروا نے
چودہواں خانوادہ قائم کیا۔ لیکن بدنظمیوں اور بدعنوانیوں
کا وہی عالم رہا۔ یہاں تک کہ ایک سامی النسل
گروہ کی یورش نے مصری نظامِ حکومت کا دفتر ہی
اُلٹ دیا۔

یہ نو وارد فاتح جو تنگنائے سوئیز کی راہ مصر
میں داخل ہوئے، غالباً شام کے آرامیوں سے قبائلی
رشتہ رکھتے تھے اور تاریخ مصر میں ہکساس کے نام
سے مشہور ہیں۔ لفظ "ہُکساس" کی وجہ تسمیہ بتانا مشکل

ہے۔ اس کا ترجمہ بعض مورخین نے "شبانی ملوک"
اور بعضوں نے "ریگستانی شہزادے" کیا ہے۔

یہ لوگ بڑے تجربہ کار سپاہی تھے، اور مصریوں
سے کہیں زیادہ مسلح تھے۔ انھیں کی بدولت مصری
لوگ گھوڑوں اور جنگی رتھوں کے مصرف سے
روشناس ہوئے۔ لیکن شائستگی اور تمدن میں وہ
اپنے مفتوحوں کے ہمسر نہ تھے۔

ہکساس تقریباً دو سو سال تک مصر پر متصرف
رہے۔ فراعنہ کے دو خانوادے (پندرہواں اور سولہواں)
انھیں کے قائم کردہ تھے۔ ابتدا میں صرف شمالی
علاقے پر اُن کا عمل دخل تھا، لیکن بعد کو جنوب
بھی اُن کے حلقۂ اثر میں آگیا۔ یہاں تک کہ
تھیبیہ کے حکمراں بھی کچھ عرصے کے لئے اُن کے

اقتدار کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بایں ہمہ یکساسی فراعنہ اہل مصر کے احساساتِ قومی کو مغلوب کرنے سے قاصر رہے۔ سب سے پہلے تھیبیہ کے فرماں رواؤں نے آزادی حاصل کی، اور سولہویں خانوادے کے پہلو بہ پہلو ایک دوسرا خانوادہ قائم کر لیا جو تاریخ میں سترھواں خانوادہ کہلاتا ہے۔ اسی تھیبی خانوادے کی سرکردگی میں قومی تحریک نے بہت زور پکڑا۔ پردیسیوں سے نفرت اور بیزاری نے مصریوں میں حریت اور وطن دوستی کی روح پھونک دی۔ عین اس موقعے پر تھیبیہ کے ایک نوجوان شہزادے آخمیس نے اپنی قیادت میں شمال و جنوب کو یکدل کر کے پردیسی فاتحوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک عام بغاوت

کے ذریعے جو تاریخ مصر میں جنگ آزادی کے نام
سے مشہور ہے، اُنھیں مصر سے نکال باہر کیا۔
یہ ہے مختصر سا خاکہ مصر کے اُن سیاسی
حالات و تغیرات کا جو مِنِعس کی قائم کردہ مملکت کے
آغاز سے ہکساسوں کے خروج تک تخمیناً دو ہزار سال
کے عرصے میں ظہور پذیر ہوتے رہے۔ آیندہ باب
میں ہم مختصراً یہ بتائیں گے کہ اسی زمانے میں
سامرستان کی صورت حال کیا تھی۔ اور وہاں کس
قسم کے تغیرات رونما ہوئے۔

باب سولھواں

قدیم ترین سلطنتیں

(سامرستان)

پہلے پہل سامرستان میں بھی تقریباً وہی حالات کار فرما رہے جو مصر میں۔ یہاں بھی شہری مملکتیں آپس میں سرگرم جدال رہا کرتی تھیں۔ کبھی ایک مملکت فتحمند رہتی، کبھی دوسری۔ لیکن سامری تاریخ کا یہ حصہ کچھ اس طرح تاریکی میں ڈھکا ہوا ہے، کہ اس کو ایک مسلسل اور مربوط پیرائے میں قلمبند کرنا یکسر ناممکن ہے۔ برآمد شدہ کتبوں، مجسموں اور دیگر آثار سے گو سامری بلاد

کے شاہی گھرانوں اور اُن کے بادشاہوں کے ناموں کا پتہ لگتا ہے، لیکن اُن کی باہمی معرکہ آرائیوں اور فتوحات پر کافی روشنی نہیں پڑتی۔ لہذا ہم سامرستان کے سیاسی تغیرات کی داستان کو اب سے صرف پانچ ہزار سال قبل کے حالات سے شروع کریں گے۔

اُس وقت جبکہ مصر میں دوسرا خانوادہ بر سرِ حکومت تھا، سامرستان میں شہر لاغاش نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ لاغاش کا اپنے گرد و نواح کے شہروں پر صرف ذہنی حیثیت ہی سے تسلط نہ تھا، بلکہ اُس کے فرمانرواؤں نے بعض سامری شہروں کو اپنے زیرِ حکومت بھی کر لیا تھا جن میں اَوما، ایرک، اور عُور خاص طور پر

ذکر کے قابل ہیں۔ لاغاش کا اقتدار دو سو سال سے زائد عرصے تک رہا۔ اس کے بعد اُس پر ایک ناگہانی آفت نازل ہوئی۔ شہر اُوما کے ایک کاہنی تاجدار کا لڑکا دفعتہً حملہ آور ہوا۔ اور قتل و غارت کا میدان گرم کرکے تمام شہر کو یک لخت تباہ و تاراج کر دیا۔

اس شہزادے کا نام لاغول زغیشی تھا۔ اُس کا شمار دُنیائے قدیم کے کامراں سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ اُس نے یکے بعد دیگرے متعدد شہروں کو فتح کرکے تمام سامرستان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور ایرک کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ عکادیوں کی شہری مملکتیں بھی جو سامرستان کے شمال جانب واقع تھیں، اُس کی زد سے جانبر نہ ہو سکیں۔ لیکن

لاغول زغیشی نے اسی پہ اکتفا نہ کی، بلکہ خلیج فارس سے بحیرۂ روم تک ساری شہری مملکتوں کو جو مختلف گروہ و قبائل کی قائم کردہ تھیں، اپنے زیر اقتدار کر لیا۔ یہ ہے پہلی سلطنت جس کے متعلق ہمیں وقوف حاصل ہے۔

لیکن یہ سلطنت زیادہ عرصے تک نہیں رہی، اس لئے کہ اس کے قیام سے تخمیناً پچیس سال بعد ہی عکادیوں میں سارگن نامی ایک بڑا قائد پیدا ہوا جس نے آس پاس کے سامیوں کو یکجہت کر کے لاغول کے خلاف معرکہ آرائی کی، اور اس کو معزول کر دیا۔ تمام سامرستان پہ عکادی متصرف ہو گئے، اور مرکز حکومت ایرک سے عاقدہ منتقل کر دیا گیا جو خود سارگن کا قائم کردہ شہر تھا۔

سارگن نے عیلامیوں کو جو وقتاً فوقتاً سامرستان پر حملے کیا کرتے تھے، شکست فاش دی۔ بعد ازاں مغرب جانب عامریوں پر چڑھائی کی اور اُن کو بھی اپنا محکوم بنا لیا۔ سارگن کی سلطنت جو عام طور پر سامری عکادی سلطنت کہلاتی ہے، عیلام سے لے کر ماورائے شام یعنی کوہ طارس تک پھیلی ہوئی تھی۔

عکادی سلطنت کے ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سامیوں کی اقبال مندی کی ابتدا سارگن کی فتوحات سے ہوتی ہے، اور دوسرے سامی گروہ مثلاً فینیقی اور کسّاسی جن کا تذکرہ سہولت و تسلسل کی خاطر ہم نے پچھلے ابواب میں کیا ہے، عکادیوں سے کم و بیش ایک ہزار

سال بعد صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوئے۔

قدیم سامی دنیا میں سارگن کے نام کی عزت و توقیر اُس کے بعد بھی صدہا سال تک ہوتی رہی اُس کی پیدائش، تربیت، اور زندگی کے ابتدائی حالات کے متعلق افسانے گھڑے جانے لگے، جیسا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں قومی مشاہیر کے بارے میں ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ سارگن کے بارے میں جو قصہ حکادیوں کے ہاں مشہور تھا، قریب قریب اسی قسم کے قصے بعد کو یہودیوں میں حضرت موسیٰ، ہندوؤں میں کرن، اور یونانیوں میں پرسیوس کے متعلق مشہور ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سارگن کی ماں نے اپنے نومولود بچے کو ٹوکرے میں رکھ کر دریا میں بہا دیا تھا۔ ٹوکرا بہتے بہتے ایک کسان کے

ہاتھ لگا۔ کسان نے بچے کی پرورش کی اور اُس کو زراعت و باغبانی کے گُر سکھلائے۔ لڑکا بڑھ کر باغبان بنا، اور اپنی خدمات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے لگا کہ اُس کی دیوی نے خوش ہوکر اُسے بادشاہت کے رُتبے تک پہنچا دیا۔

اس قصے کی اصلیت جو کچھ بھی ہو، اتنا ضرور تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سارگن کسی بادشاہ یا کسی شاہی گھرانے سے دُور کی بھی نسبت نہ رکھتا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی تھا جو اپنے زور بازو اور ذاتی اثر کی بدولت ایک جری قائد، اور پھر ایک سلطنت کا بانی بن گیا۔

سارگن کی حکومت کوئی پچاس سال، اور اُس کی قائم کردہ سلطنت ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے

تک رہی۔ اُس کے جانشینوں میں سب سے مشہور
نارم سین تھا جس نے سارگن کی سلطنت کو مستحکم کیا۔
نارم کے عہد میں اکثر شہروں میں بغاوتیں برپا ہوئیں،
لیکن اس نے سب کی بُری طرح خبر لی خصوصاً قلیش
کی جو ایک سامی شہر تھا اور جس کا دوسرے شہروں
کے ساتھ باغیانہ ساز باز کرنے میں نمایاں حصہ تھا۔
اس کے بعد نارم نے مغرب میں عکادیوں کے
اقتدار کو از سرِ نو قائم کیا، اور کوہ طارس کے شمالی
علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت کے حدود کو وسعت
دی۔
لیکن نارم کے جانشین کے عہد میں بغاوتیں پھر
شروع ہوئیں، اور مشرق سے عیلامیوں اور مغرب
سے عامریوں کی یورشیں ہونے لگیں۔ کچھ عرصے بعد

گتھیوں نے جو عیلام کے شمال میں بس گئے تھے،
اور جن پر سارگن اور نارم سنے بارہا چڑھائی کی تھی،
بے حد زور پکڑا اور ایک زبردست حملے کے بعد تمام
سامرستان اور عکاد پر متصرف ہو گئے۔
گتھیوں کے متعلق یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ
لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ مورخین
کہتے ہیں کہ ان کا حیتیوں سے نسلی تعلق تھا۔ بعض
کا خیال ہے کہ یہ لوگ میتانی تھے جو عیلام کے شمال
میں بس گئے تھے۔ بہر حال اِن لوگوں کا سلسلۂ حکمرانی
تقریباً ڈیڑھ سو سال تک رہا۔ پھر ایرک کے ایک
شہزادے نے اُنھیں سامرستان اور عکاد سے نکال
باہر کیا۔ اس کے بعد تین سو سال سے زائد عرصے
تک انتشار اور بدنظمیوں کی گرم بازاری رہی۔ عور،

عیسان، اور لارسا کے فرمانروا یکے بعد دیگرے شاہی اقتدار کے دعوی دار ہوئے اور اپنی حکومت کو قائم رکھنے اور وسعت دینے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ بالآخر لارسا اور اس کے زیر اثر شہروں کی حکومت عیلامیوں کے ہاتھ لگی اور لارسا میں عیلامی گھرانہ قائم ہوگیا، جس کے دوسرے تاجدار، رِم سین نے آس پاس کے علاقوں کو ضم کرکے تمام سامرستان اور عکاد پر اپنا اثر جمانے کی کوشش کی۔ لیکن رِم سین کے منصوبے مغرب کی ایک بڑھتی ہوئی قوت کے آگے بار ور نہ ہو سکے۔

عیلامیوں کے لارسا میں مسلط ہونے سے کم و بیش چالیس سال پہلے ہی سامرستان کی مغرب جانب ایک عامری شہر نے جو بابل کہلاتا تھا، غیر معمولی

اہمیت حاصل کرلی تھی اور یہاں پر عامریوں کا ایک فرمانروا گھرانہ بھی قائم ہوچکا تھا۔ بابل ایسے موقع پر آباد تھا جہاں سے مشرق کی طرف ایران، اور مغرب کی طرف شام کو تجارتی راستے نکلتے تھے۔ یہ مرکزیت اور محلِ وقوع سامرستان کے بیشتر شہروں کو نصیب نہ تھا۔ لیکن بابل کا اصلی عروج اور اُس کی مرفہ الحالی عامری گھرانے کے چھٹے فرمانروا، حمرابی کے تدبر اور اعلیٰ سپہ گری کا نتیجہ تھی۔

حمرابی اب سے تقریباً چار ہزار سال قبل، اپنے باپ کی جگہ بابل کا فرمانروا ہوا جبکہ مصر میں گیارہواں خانوادہ برسرِ حکومت تھا۔ ابتدا میں اس کی حیثیت ایک شہری مملکت کے فرمانروا سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ایک با اقتدار شہنشاہ، اور ایک سلطنت

کا بانی بن گیا۔

حمرابی کا سب سے بڑا حریف رعم سین تھا، اس لئے اُس نے سب سے پہلے رعم سین کے خلاف معرکہ آرائی شروع کردی، یہاں تک کہ رعم سین کو اپنے مقبوضہ علاقوں سے مجبوراً دست کش ہونا پڑا۔ اِس کے بعد حمرابی نے اُن سامری شہروں کو فتح کرنا شروع کیا جو اُس زمانہ میں اپنی اپنی جگہ آزاد حکومت کے مراکز تھے۔ پایان کار تمام سامرستان اور عکاد اُس کے قبضے میں آگیا۔ حمرابی کے یہ مفتوحہ علاقے بابلستان، اور اس کی سلطنت بابلی سلطنت کہلانے لگی جس کا دارالحکومت بابل قرار دیا گیا۔

شمال، مغرب، اور جنوب میں بھی اُس نے اپنی سلطنت کے حدود بڑھائے، اور اپنے عہد حکومت

کے اختتام سے کچھ پہلے اُس نے آخری بار رعمسیس
کو ایک زبردست شکست دی جس کے بعد عیلامی
قوت کے رہے سہے آثار بابلستان سے زائل ہو گئے۔
لیکن حمرابی کی شہرت کو محض فوجی معرکوں
اور فتوحات پر منحصر نہ سمجھنا چاہیئے۔ اُس کے عہد کا عظیم الشان
کارنامہ در اصل وہ قوانین ہیں جو اُس نے اپنی
سلطنت میں نافذ کئے تھے۔ یہ قوانین ایک سرے
سے اُس کے اپنے بنائے ہوئے نہ تھے، بلکہ ان
کا ماخذ وہی مروجہ سامری آئین و رسوم تھے جنھیں
حمرابی نے نظر ثانی اور ضروری ترمیم کے بعد ایک
مربوط ضابطۂ قانون کی شکل میں مرتب کیا تھا۔ اُس
نے سول عدالتوں کو بھی تقویت بخشی جس کے باعث
کاہنوں اور کاہنی عدالتوں کا اقتدار اور دقیانوسی طریقۂ

عدل بتدریج رخصت ہوگیا۔

حمرابی نے بیالیس سال سلطنت کی۔ اُس کے عہدِ حکمرانی میں بابلستان امن و عافیت اور آسودہ حالی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ لیکن اُس کے مرنے کے بعد ہی بغاوت کیشوں نے پھر سر اُٹھایا اور سارے انتظامات درہم و برہم کردیئے۔ مشرق جانب سے قسطیوں نے بابلی علاقہ پر دست درازی اور لوٹ مار مچادی۔ جنوب میں ایک چھوٹی سی خودمختار قلمرو جو بحری قلمرو کہلاتی تھی، دجلہ کے دہانے پر قائم ہوگئی جس کے فرمانرواؤں نے (جو بحری سلاطین کہلاتے تھے) بابلی سلطنت کے جنوبی علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا شروع کیا۔

حمرابی کے جانشین سب کے سب کمزور تھے،

اور کسی میں اس کا سا تدبر اور حوصلہ نہ تھا۔ آخر کار حمرابی کی موت سے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد حیتیوں نے جو ایشیائے کوچک میں بہت طاقتور ہو چکے تھے، بابلستان پر چڑھائی کی جس کے بعد حمرابی کے نام نہاد جانشین اور اُن کے ساتھ بابلی سلطنت کے باقی ماندہ آثار بھی بکلی نابود ہو گئے۔

حیتیوں کے حملے سے تقریباً ڈھائی سو سال بعد تک جو حالات بابلستان میں کار فرما رہے، اُن کے متعلق تاریخ دانوں کے پاس معتبر اطلاعات نہیں ہیں۔ البتہ اس کے بعد یعنی تقریباً اُسی زمانے میں جبکہ ہکساسوں نے مصر پر حملہ کیا، قسطیوں کے ایک سردار گندیش نامی نے گھوڑوں، اور جنگی رتھوں کے ساتھ بابل پر چڑھائی کی اور اُس کو فتح کر کے قدیم سامری

اور عکاوی علاقوں پر اپنا تسلط جما لیا۔ لیکن سامرستان کے جنوب میں بحری سلاطین کی قلمرو کوئی چالیس سال تک بدستور آزاد رہی جس کے بعد وہ بھی قسطی سلطنت میں ضم ہوگئی۔

قسطیوں کے بارے میں یہ واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہکساسوں کی طرح یہ لوگ بھی تمدن و شائستگی میں اپنے مفتوحوں کے ہمسر نہ تھے، نیز یہ کہ ہکساسوں کی طرح انھوں نے اپنے مفتوحوں کو گھوڑوں اور جنگی رتھوں کے استعمال سے پہلے پہل روشناس کیا۔

قسطیوں کی بابلستان میں جواب قردونیاشش کہلانے لگا تھا، تقریباً چھ سو سال تک سلطنت رہی۔ اس طویل عرصے میں تمام قسطی علاقہ صلح و عافیت

کا مسکن رہا جس کے باعث تجارت، صنعت و حرفت، اور تعلیم میں نمایاں ترقی ہوئی۔

قسطیوں کی حکومت اُمرائے فوج کے بل پر قائم تھی۔ اُن کے عہد کا ممتاز خاصہ نظامِ آراضی کی وہ تبدیلی تھی جو جاگیری نظام کی تشکیل کا باعث ہوئی۔ یہ نظام، مصر کے اُس جاگیری نظام سے جو پانچویں خانوادے کے عہد میں قائم ہوا تھا، بہت قریبی مماثلت رکھتا تھا۔

اب ہم قسطیوں کو قرودیناش پر حکمراں چھوڑ کر مصر کے اُن سیاسی تغیرات کی جانب متوجہ ہوں گے جو آخیمس کی بغاوت یا جنگ آزادی کے بعد مصر میں رو نما ہوئے۔

باب سترہواں

مصر کا عروج

(پہلا دور)

مصر کو ہکساسیوں سے بکلی پاک کرنے کے بعد آخمیس نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اس خانوادے کی داغ بیل ڈالی جو تاریخ مصر میں اٹھارواں خانوادہ کہلاتا ہے۔

اس کے سامنے ہنوز چند امور تھے جن پر دسترس پانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ممالک شام، فنیقیہ، اور فلسطین کے سامیوں کی مصر کی جانب متفقہ یورش کا سدِّباب، اور پھر ایک وسیع قلمرو کا منظم بندوبست،

آخمیس کی توجہ اور تدبر کا محتاج تھا۔ لیکن وہ ان دونوں اہم ذمے داریوں کے انصرام میں بہ احسن الوجوہ کامیاب رہا۔

مصر کی بے اندازہ دولت جو اب تک پردیسیوں کے تصرف میں تھی، پھر فرمانروایانِ ملک کے دستِ قدرت میں آئی۔ ملکی صناعوں اور دستکاروں کے ہاتھ اہلِ ملک کے عقائد و تخیلات کی ترجمانی میں پھر سرگرمِ کار نظر آنے لگے۔ غرضکہ اٹھارویں خانوادے کے قیام سے مصر میں از سرِ نَو ترقی و تمول، اور تزک و احتشام کا دَور شروع ہوا۔

اس خانوادے کے تیسرے فرعون کے عہدِ حکومت تک مصر کافی طاقتور، اور فتوحات و ملک گیری کے لئے ہر طرح آمادہ ہو چکا تھا۔ لیکن

تھاتھمیس اول نے محض قدیم اسلوب پر فتوحات کا سلسلہ ڈالا۔ مفتوحہ علاقوں پر اپنا تسلط جمانے، اور اُن پر منظم اساسِ حکومت قائم کرنے کی اُس نے کوشش نہیں کی۔ اِس لئے چھٹے فرعون تھاتھمیس ثالث کے عہدِ حکومت یعنی ہکساسیوں کے خروج سے تقریباً ایک سو سال تک، مصر کو شاہنشہی کے رتبۂ بلند پر پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔

تھاتھمیس ثالث کی سلطنت جنوب میں نیوبستان یا حبش، اور شمال میں فلسطین، فنیقیہ، اور شام پر مشتمل تھی۔ اُس نے میتانیوں کے دارالحکومت قراقمش پر بھی دھاوا کیا، اور میتانی اُمرائے فوج کو اپنا باجگذار بنا لیا۔ حیتیوں اور اشوریوں کی دور اُفتادہ قلمرویں بھی جن کا ہم متعاقب ذکر کریں گے، تھاتھمیس

ثالث کے پاس تحائف و ہدایا روانہ کرتی تھیں۔

اس زمانے میں مصر کی نہ صرف فوجی، بلکہ بحری قوت بھی تمام دُنیا میں مسلّم تھی۔ بحیرہ روم کے مشرقی حصے میں مصری بیڑوں کی کارفرمائی رہا کرتی تھی، اور قریطیہ و قبرس کا شمار بھی مصر کے باج گزار علاقوں میں تھا۔

تھاتھمیس ثالث ایک جری سپاہی، ایک چالاک نبرد کار، اور ایک زبردست سپہ سالار تھا۔ لیکن بحیثیت مُدبر اُس کا رُتبہ اِس سے بھی بلند تھا۔ وہ ہمیشہ تمام ملک کا بہ نفس نفیس دورہ کرتا، اور چشم دید حالات کی بنا پر انصاف گستری اور حصول مالگزاری کے باب میں سہولتیں مہیّا کرتا تھا۔ اُس کے عہد میں ملک کے پیدا آور وسائل کی ترقی میں مفید تدابیر

بروئے کار لائی گئیں، اور سلطنت و نیز بیرونِ سلطنت کی پیداوار کھینچ کر مصر میں داخل ہونے لگی۔

تھاتھیس کی ایشیائی سلطنت کا طریقۂ تنظیم

بعض حیثیتوں سے ہمارے زمانے کی برطانوی سلطنت کے آئین حکومت سے قریبی مماثلت کے پہلو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے والیانِ ریاست کی طرح، مختلف علاقوں کے شہزادوں کو فراعنۂ مصر کے مطیع اور باجگزار ہونے کی شرط پر اپنے علاقوں میں حکمرانی کا موقع دیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں ان شہزادوں یا رئیسوں پر فراعنہ کا ایک عہدہ دار بھی متعین رہتا تھا جو برطانوی رزیڈنٹ کے سے فرائض انجام دیتا۔ تمام مصر کے مقاموں اور قلعوں پر مصری فوج کی چھاؤنیاں رہتی تھیں۔

محکوم رؤسا اور اُن کی رعایا کے دلوں میں فراعنہ کی شاہی سطوت و اقتدار کے ساتھ ہمدردی پیدا کرنے کی غرض سے، ہر ممکنہ کوشش بروئے کار لائی جاتی اور خصوصاً اس مقصد کے حصول کے لئے دارالسلطنتِ تھیبیہ کے کلیہ رُوسا میں ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ محکوموں کے مذہبی عقائد و رسوم میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی، لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود بھی مفتوحہ علاقوں میں مصری آئین حکومت کی جانب سے برہمی کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ تھاتھمیس کی موت کے بعد ہی رؤسائے شمال نے علَم بغاوت بلند کیا، لیکن مصر کی قوت کے آگے وہ سربر نہ ہو سکے۔ تھاتھمیس کے بیٹے آمن خوطف ثانی نے اُن کی معقول سرزنش کی،

اور سات اسیر شاہزادوں کو اپنے جہاز کے جلو میں جیتے جی اُلٹا لٹکا کر براہِ نیل تھیبیہ داخل ہوا۔ اِن اسیروں میں سے چھ کو اُس نے مصری دیوتا آمن کے مندر میں قتل کیا، اور ساتویں کو رعایا ئے جنوب کے تنبیہ کی غرض سے نیوبتانی سرحد کے حصار پر لٹکا دیا۔ آمن خوطف کے اس وحشیانہ طرز عمل سے محکوم علاقوں میں ایسی دہشت سمائی کہ اس کے جیتے جی پھر کسی کو بغاوت برپا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

البتہ اُس کے مرنے کے بعد ہی شہزادگانِ شمال کے دلوں میں بدیسی حکومت کا جُوا اُتار پھینکنے کی خواہش پھر موجزن ہوئی۔ لیکن آمن خوطف کے لڑکے تھاتھمیس چہارم نے انھیں شکست

دے کر مصر کے اقتدار کو دو بارہ مستحکم کیا۔ اس کے بعد سے مصر کی قوت اس قدر محکم ہو گئی کہ تقریباً نصف صدی تک پھر کسی کو مصر کے اقتدار سے منحرف ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

تھاتھمیس چہارم کے عہدِ حکومت میں مصر اور میتانیوں کی قلمرو کے درمیان دوستانہ روابط تھے۔ میتانیوں کے دلوں میں گھر کرنے کی خاطر، تھاتھمیس نے فراعنۂ مصر کی سنّت قدیم سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا، اور ایک میتانی شہزادی کو بیوی کی حیثیت سے اپنی حرم سرا میں داخل کر لیا سیاسی اغراض کے تحت مناکحت کی یہ پہلی مثال ہے جس کے متعلق ہمیں وقوف حاصل ہے۔ تھاتھمیس کی یہ نئی تحریک اُس کے جانشینوں کے

لئے بھی تقلید کا باعث ہوئی۔

تھاتحمیس کے بعد اُس کا بیٹا آمن خوطف ثالث اُس کا جانشین ہوا۔ اس کا دَور حکومت مصر کا زرین عہد تھا۔ بیشتر مورخین کا خیال ہے کہ شاہانہ تجمل اور کرّو فر کے اعتبار سے کوئی فرعون، آمن خوطف ثالث کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ملک ملک کی دولت سمٹ کر اُس کے خزانے کا رُخ کر رہی تھی، اور اسی فراوانی کے ساتھ مختلف اصنافِ فنون کی نشو و نما پر اُس کا مصرف ہو رہا تھا۔ سیاسی یا فوجی بکھیڑوں سے آمن خوطف بالکل نچنت ہو چکا تھا۔ سلطنت کی تنظیم جس کی ابتدا اُس کے پیشرؤوں نے کی تھی، اُس کے عہد تک اتنی محکم ہو چکی تھی کہ داخلی انتشار کی جانب سے بھی کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ لہٰذا

اُس نے اپنی ساری توجہ، فن اور فن کارانہ رنگینیوں کی راہ میں صرف کردی، اور مصر کے ستارۂ اقبالمندی کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔

لیکن اس طمطراق اور جلوہ سامانیوں کے عقب میں، آنے والی مصیبت کے خطرات مصر کی بد اقبالی کی خبر دے رہے تھے۔ ایشیائے کوچک میں حِتّیوں کی قلمرو اپنے بادشاہ، شبیلولوما کی قیادت میں روز بہ روز طاقتور ہو رہی تھی۔ شبیلولوما اپنی ستیزہ کاری اور سپاہیانہ دلیری کے زعم میں ایک سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا، لیکن اُس کی پہلی چال (یعنی میتانیوں کی قلمرو پہ اُس کی چڑھائی) میتانی فرمانروا، دشرتھ کے دلیرانہ مقابلے کے باعث بار آور نہ ہو سکی۔

بایں ہمہ مصری صوبے داروں نے آمن خوطف سے حیتیوں کے خلاف شدید چارۂ کار اختیار کرنے کی درخواست کی، لیکن اُس نے کوئی توجہ نہ کی اور حیتی خدشے کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصری سلطنت کو آمن خوطف چہارم یا آخناطون کے عہد میں اس بے اعتنائی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اخناطون بلا کا تصوریت پسند اور جوشیلا مصلح تھا جو مذہب، اخلاق، اور آرٹ میں تصوریت پیدا کرنے کے جوش میں اپنے روحانی تصورات سے مصریوں کو روشناس کرانا چاہتا تھا۔ لیکن اس زمانے کے مصری لوگ روحانیت سے کوسوں دُور تھے، اس لئے اخناطون کی تمام کوششیں نہ صرف بے سود بلکہ فرائضِ حکمرانی کی انجام دہی میں بھی، خلل انداز

ثابت ہوئیں۔

اس میں شک نہیں کہ بڑے بڑے تصوریت پسند ایک کارواں فرمانروا اور مدبر بھی ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کی کاروانی آخناطوں میں مفقود تھی۔ بحیثیت فرمانروا وہ بالکل ناکام ثابت ہوا۔ مذہبی اُلجھیڑوں میں پھنس کر اُس نے کاروبارِ حکومت کی جانب بے اعتنائی برتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے کل پرزے ناس ہوکر رہ گئے، اور مصر کی وہ عظیم سلطنت جس کی بنیاد تھاتھمیس ثالث کے ہاتھوں پڑی تھی تقریباً ایک صدی تک اپنی تابناکی دکھا کر بتدریج پارہ پارہ ہوگئی۔

سنبیلوما نے میتانی قلمرو کو فتح کرکے اپنی شہنشاہت قائم کرلی۔ اور اخناطوں کے جانشین اور داماد،

سخرا اور طوطنخ آمن کے مختصر عہد حکمرانی کے اختتام
پر شام میں عامریوں اور حیتیوں نے اپنا اپنا تسلط
جمایا۔ فلسطین پر سامی آوارہ گردوں کی یورشیں ہونے
لگیں۔ ان سامی آوارہ گردوں میں ایک گروہ عبرانیوں
کا بھی تھا جن کا تفصیلی ذکر ایک علیحدہ باب میں
ہم آیندہ پیش کریں گے۔

اٹھارہویں خانوادے کے آخری فرعون کا نام
عئی تھا جو مصر کی حد تک بھی لاشئے محض سمجھا
جاتا تھا۔ اس کی تخت نشینی ایک با اثر امیر خورم خیب
کی کوششوں کا نتیجہ تھی، جو اخناطوں اور اس کے
جانشینوں کے زمانے میں بھی ذمہ دارانہ عہدہ و مناصب
سے سرفراز تھا۔ خورم خیب ملک کے تمام طبقوں میں
بے حد مقبول تھا۔ چنانچہ عئی کی موت کے بعد

جب اُس نے مصر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اُنیسواں خانوادہ قائم کیا، تو اُس کو کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

اُنیسویں خانوادے کے ظہور سے مصر کے نصیب پھر جاگے۔ اسی خانوادے کے ایک فرعون نے گم شدہ سلطنت کے بیشتر حصوں کو دوبارہ فتح کیا جس کی بدولت مصر کو ازسرِ نو عروج حاصل ہوا۔ اس کا تفصیلی ذکر ہم آیندہ باب میں کریں گے۔

باب اٹھارواں

مصر کا عروج

(دوسرا دور)

خورم خیب کو مصر کی از سرِ نو تنظیم کا بڑا فکر تھا۔ کشور کشائی اور ملک گیری کے منصوبے خود گھر کے معاملات درست ہونے تک خارج از بحث تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ اُس نے اپنی تمام توجہ داخلی نظم و نسق کی جانب صرف کی، اور بہت جلد نظام حکومت کے بگڑے ہوئے قوام کو درست کیا۔

خورم خیب نے تیس سال سے زائد عرصے تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام

دیئے ۔ اُس کے مرنے کے بعد عنانِ حکومت رعمسیس کے ہاتھ آئی جس کا شاہی گھرانے سے تعلق تھا اور جسے نورم خیب نے پہلے ہی سے اپنا جانشین منتخب کر لیا تھا ۔ لیکن تختِ فراعنہ کا جائزہ لیتے وقت ہی رعمسیس اول خاصہ مُسِن ہو چکا تھا، اور کم و بیش ایک سال تک حکمرانی کرنے کے بعد وہ مر گیا اور اُس کا بیٹا سیتھی اُس کا جانشین ہوا۔

سیتھی بڑا جنگجو فرعون تھا ۔ اپنی تخت نشینی کے بعد ہی اُس نے مصر کی گم شدہ سلطنت اور کھوئے ہوئے وقار کو از سرِ نو حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ اس نیت سے فلسطین پر اُس کا پہلا دھاوا ہوا، لیکن اس دھاوے کا محض بھرم ہی بھرم تھا، اس لئے کہ ایک فوجی مظاہرے سے زیادہ

اس کی اہمیت نہ تھی۔ تاہم اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ فلسطین والوں نے سہم کر مصری لشکر کے آگے ہتیار ڈال دیئے، اور فنیقیہ کے بادشاہوں اور تاجر رئیسوں کو بھی باجگزار بننے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آیا۔

غرضکہ نصف صدی کے فصل کے بعد مصر کی سطوت نے دوبارہ جنم لیا۔ دولت بے پایاں کی چاروں طرف سے بارش ہونے لگی، اور مصری بلاد تجارتی کاروبار اور صنعت و حرفت کی چہل پہل سے معمور نظر آنے لگے۔

لیکن شام کا شمالی حصہ بدستور حیتیوں کے قبضے میں رہا۔ شبیلو لوما کا پوتا، مرسل جو اس زمانے میں حیتیوں کا شہنشاہ تھا، سیتھی سے کچھ کم طاقتور نہ تھا۔ چنانچہ دونوں کے مابین ایک معاہدہ طے پایا

جس کے رُو سے دونوں نے اپنے موسّسہ علاقے پر اپنے حریف کے حق تصرف کو تسلیم کیا۔

سیتھی نے بیس سال حکمرانی کی جس کے بعد اس کا دوسرا لڑکا رعمسیس ثانی اس کا جانشین ہوا۔ رعمسیس ایک طامع، خود سر، شریر النفس اور دبنگ فرعون تھا جس نے اپنے بھائی کو تختِ سلطنت سے محروم کرکے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ اپنے عہد حکومت کے پانچویں سال میں اس نے شمالی شام کو فتح کرنے کے عزم سے لشکر کشی بھی شروع کی۔ لیکن حیتیوں کے شہنشاہ مُوتَلِس نے (جو مرسل کا بیٹا تھا) رعمسیس کے منصوبوں کو سر بر ہونے نہ دیا، اور بڑی پامردی کے ساتھ مصری حملے کو روکا۔

رعمسیس کے مزید حملوں اور معرکوں کے متعلق

ہمارے پاس کافی اطلاعات نہیں ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ تمام معرکے بڑے سنگین تھے، نیز یہ کہ تقریباً تین سال کی متصل جد و جہد کے بعد اُس نے فلسطین پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کیا۔ میتانیوں پہ بھی رعمسیس فیروز مند رہا، لیکن اُسے شمالی شام کو جو تھاتھمیس ثالث کے عہد میں سلطنت مصر میں شامل تھا، حیتیوں کے قبضے سے واپس لینے میں ناکامیابی ہوئی۔

اپنے عہد حکومت کے اکیسویں سال میں رعمسیس نے حیتی شہنشاہ، حیتوسل سے جو موتلیس کا بھائی اور جانشین تھا، تحریری معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ اپنی نوعیت کا پہلا اقرار نامہ تھا جس پر حقیقی معنیٰ میں سیاسی اقرار نامے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ گو اس قسم کا معاہدہ سنیتھی اور مرسل، نیز اس سے قبل خورم خیب

کے عہد میں بھی ہوا تھا جن کے متعلق اِس اقرار نامے میں حوالہ موجود ہے۔ لیکن سیاسی یا دَوَلی معاہدے کی یہ پہلی بر آمد شدہ دستاویز ہے جس میں دو سلطنتوں کے تاجداروں نے باقاعدہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ اتحاد و اخوت قائم رکھنے، اور کسی بیرونی حملے یا داخلی بغاوت کے موقعے پر اشتراکِ عمل کرنے کا عہد باندھا تھا۔ اس اقرار نامے پر فریقین کا اس سختی کے ساتھ عمل در آمد رہا کہ مصریوں اور حیتیوں نے پھر کبھی ایک دوسرے کے خلاف ہتیار نہیں اُٹھایا۔

کچھ عرصے بعد رعمسیس نے حیتوسل کی لڑکی کو اپنی زوجیت میں داخل کر لیا۔ لڑائی سے وہ بالکل سیر ہو چکا تھا۔ چنانچہ اقرار نامۂ مذکور کے بعد

ہم اس کو جنگ کرتا نہیں دیکھتے، حالانکہ مزید چھیالیس سال تک وہ زندہ اور برسرِ حکومت رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہرت و ملک گیری کا وہ جذبہ جس کی بدولت اُس نے اپنی حکمرانی کے پہلے بیس سال میں کئی ایک خونریز لڑائیاں لڑی تھیں، اُس کے سینے میں سرد ہو چکا تھا۔ بتدریج وہ اس قدر عیش پسند اور آرام طلب ہوگیا کہ سلطنت مصر کا زوال خود اُس کی آنکھوں کے سامنے ہی شروع ہوگیا۔

اُس کے مرنے کے بعد اُس کے باقی ماندہ لڑکوں میں سب سے بڑا لڑکا جو مرنفتاح کہلاتا تھا، اُس کا جانشین ہوا جس نے اپنی کبر سِنی کے باوجود متزلزل سلطنت کو بہ حدِ امکان سنبھالنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اُس نے فلسطین کی

بغاوتوں کا قلع قمع کر دیا، اور لیبیائی لشکر کو جس نے یونان کے بحری قزاقوں کے ساتھ مصر پر چھاپے مارنے میں سازباز کیا تھا، بُری طرح شکست دی۔

لیکن مصر کی بدقسمتی سے صرف دس سال تک حکومت کرنے کے بعد مرنفتاح کی موت واقع ہوئی۔ اُس کے ساتھ ہی مصر کا ادبار پھر شروع ہوا اور مرنفتاح کے دونوں جانشینوں کے زمانے میں جنھوں نے پانچ پانچ سال تک حکمرانی کی، انحطاط کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک قلیل عرصے کے لئے طوائف الملوکی کا سلسلہ رہا۔ اسی اثنار میں رعمسیس ثانی کے ایک رشتہ دار ست نخت نے پھر امن و اماں قائم کیا، اور بیسویں خانوادے کی بِنا ڈالی۔ لیکن اپنی عرق ریزانہ

مساعی کا ثمر اُسے نصیب نہ ہوا اس لئے کہ دو سال
بعد ہی وہ مر گیا۔

ست نخت کے بعد رعمسیس ثالث اُس کا
جانشین ہوا جس نے اکتیس سال مصر پر حکومت
کی رعمسیس، صفِ فراعنہ کا آخری جنگجو فرعون تھا۔
اُس کے عہد میں لیبیائیوں اور یونان کے بحری
قزاقوں نے سمندر کی جانب سے حملہ کیا، اور خشکی
کی جانب سے فلسطیوں نے چڑھائی کی۔ یہ فلسطی
وہی ایجینی لوگ ہیں جن کا بحر پیماؤں کے باب
میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جب قریطہ کی مینا سی عملداری
کا خاتمہ ہو چکا اور یونانی قزاقوں نے انھیں ان کے
مقبوضہ جزائر سے نکالنا شروع کیا، تو یہ لوگ قرب و
جوار کے ساحلی علاقوں پر منتقل ہونے لگے۔ اِن

میں سے ایک قبیلے کے لوگ جو فلسطی کہلاتے تھے، شام کی جنوب جانب نواحِ کنعان میں (جہاں عبرانی پہلے ہی بس چکے تھے) ایک مختصر سے حصے پر لبِ ساحل آباد ہو گئے تھے جو اِن لوگوں کے ورود کے بعد فلسطیہ کہلانے لگا۔

رعمسیس نے ان فلسطیوں کو شکست دی، اور مصر کو لیبیائیوں اور یونانیوں کے حملوں سے بھی نجات دلائی۔ تاہم ان لوگوں نے پھر سر اُٹھایا لیکن رعمسیس نے اس مرتبہ بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور خشکی و سمندر دونوں جانب سے گھیر گھیر کر اُنھیں رگیدا۔

رعمسیس ثالث کی فتوحات نے مصر کو بیرونی حملوں سے نجات تو دلائی، لیکن مصری سلطنت

کی درہمی کا وہی عالم رہا۔ چنانچہ اُس کے مرنے سے پہلے ہی مصر کی دوسری سلطنت جس کی بنا رستیمی کے ہاتھوں ہوئی تھی، تقریباً ڈیڑھ صدی تک قائم رہنے کے بعد بالآخر دم توڑنے لگی۔

رعمیس ثالث کے بعد رعمسیس چہارم اور چہارم کے بعد رعمسیس پنجم اور اسی طرح رعمسیس یازدہم تک اس کے جانشینوں کا سلسلہ رہا۔ اس خانوادے کے جو تقریباً ایک صدی تک قائم رہا، آخری تاجدار سب کے سب ناکارہ اور کاہنوں کے دست نگر تھے۔ یہاں تک کہ رعمسیس یازدہم کے مرنے پر تھیبیہ کے صدر کاہن نے حکومت اپنے دست قدرت میں لی اور اکیسواں خانوادہ قائم کیا۔

اکیسویں خانوادے کی تقریباً ڈیڑھ صدی تک حکمرانی

رہی جس کے بعد مصر کی حکومت لبیانیوں کے ہاتھ آئی جنھوں نے بائیسواں خانوادہ قائم کیا۔ تیئیسواں خانوادہ بھی لبیانیوں کی ایک دوسری شاخ کا قائم کردہ تھا جو بائیسویں کا ہمعصر، اور اُس کے خاتمے سے بہت پہلے ہی آزاد طور پر حکمراں تھا۔ لبیانی حکومت تقریباً دو صدیوں تک برقرار رہی، لیکن آخری زمانے میں مصر کے تقریباً تمام شہروں میں مطلق العناں سرداروں کی حکومت تھی۔

اس کے بعد چوبیسواں خانوادہ شہر سئیس کے ایک شہزادے نے قائم کیا۔ لیکن یہ سلسلہ نہ تو عرصۂ دراز تک قائم رہا اور نہ جنوب پر اُس کی حکومت رہی، اس لئے کہ تھیبیہ اور اُس کے ملحقہ علاقوں پر نیوبستان کے حبشی الاصل باشندے متصرف ہو گئے تھے۔

چند ہی سال کے عرصے میں نیولبتانیوں نے بے حد زور پکڑا، اور اپنے حدود کو شمالی مصر تک بڑھا کر اپنا خانوادہ قائم کیا۔ ان حبشی فراعنہ نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ مصر سے پرے بہ جانب شمال لشکر کشی کرنے اور مغربی ایشیا میں عبرانیوں کی مدد سے اپنی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنا شروع کئے۔ لیکن یہ بات عملاً ناممکن تھی، اس لئے کہ وہاں ایک نئی طاقت روز افزوں ترقی پر تھی جس نے مصر کی سلطنت ثانی کے خاتمے سے پہلے ہی گرد و نواح میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ اس نئی طاقت سے ہماری مراد اشوریہ ہے جو قردونیاش یا قدیم بالبنان کے شمال میں واقع تھا، اور جس کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ ہم آیندہ باب میں پیش کریں گے۔

باب انیسواں

اشوریہ کا عروج

اشوریہ مشتق ہے آشور سے جو ایک شہری مملکت تھا۔ پہلے پہل یہاں سامریوں کی نو آبادی تھی۔ لیکن قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ شہر اسی زمانے میں، یا اس کے بعد آشور کہلانے لگا۔

اشوریہ اپنے طبعی حالات کے لحاظ سے بابلستان سے بالکل مختلف تھا۔ اُس کی زرخیز وادیاں، گھنے جنگل اور پہاڑیوں کے سلسلے، بابلستان کے سپاٹ اور شاداب میدانوں سے یکسر علیحدہ منظر پیش کرتے تھے۔ پتھر بہ کثرت پایا جاتا تھا۔ تانبے، جست اور لوہے کی بھی مشرق کے کوہستانی حصے میں کچھ کمی نہ تھی۔

اشوریہ کے سامری مستعمرین کو سامیوں کے ایک گروہ نے نکال باہر کیا، اور خود یہاں آباد ہو گئے۔ یہ نَو وارد سامی، تاریخ میں آشوریوں کے نام سے مشہور ہیں۔ اُن کے شہروں میں آشور، اور نینوا خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

سارگن کے زمانے میں یہ لوگ عکادیوں کے زیر اثر آ گئے تھے۔ عکادیوں کی محکومی سے چھوٹ کر تقریباً تین سو سال آزاد رہنے کے بعد، کچھ عرصے تک میتانیوں کے محکوم رہے۔ اس کے چند صدیوں بعد حمرابی نے انھیں مغلوب کیا، اور بہ حیثیت شہنشاہ کے آشور میں اپنی مستقل فوج متعین کی۔ حمرابی کی سلطنت کے زوال اور درہمی کے بعد، چند صدیوں تک اشوریوں نے آزادی کے ساتھ گزاری۔ پھر میتانیوں کے فرمانروا دشرتھ نے جس کا ہم نے

اس سے قبل ذکر کیا ہے، اشوریوں کو شکست دی اور کچھ عرصے تک اشوری دارالحکومت نینوا پر بھی متصرف رہا۔ لیکن اشوریوں نے بہت جلد میتانی حکومت کے جُوے کو اُتار پھینکا اور اخناطون کے عہد حکومت تک ایسی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اخناطون نے قسطی شہنشاہ بُرنا بوریاش سے جو اشوریوں کو اپنا محکوم سمجھتا تھا، دوستانہ روابط ہونے کے باوجود اشوری فرماں روا اشورُ و بَعلِت سے راست خط و کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

لیکن اشوریہ کی طاقت کا ظہور در اصل اشورو بعلِت کے پر پوتے سلما نصر کے عہد سے ہوتا ہے، جو رعمیس ثانی کا ہمعصر تھا۔ سلما نصر نے اپنی تخت نشینی کے بعد ہی اپنی قلمرو کو بہ جانبِ مغرب وسعت

دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ اُس نے میتانیوں کی قلمرو پر حملہ کیا اور گو میتانی فرمانروا کی مدد پر حیتیوں کا ہاتھ تھا، لیکن اس کے باوجود بھی سلما نصر فتحیاب رہا اور تمام ملک کو تاخت و تاراج کرتا ہوا قراقمش کی شہر پناہ کے قریب پہنچ گیا۔ یہ حملہ میتانی قلمرو کے حق میں موت کا پیغام تھا، اس لئے کہ اس کے بعد سے میتانیوں کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو گیا۔ مصری اور حیتی اب محسوس کرنے لگے کہ ایک طاقت اُن کے مقابل میں ہمسری کی دعویدار پیدا ہو چکی ہے۔

تیس سال تک حکمرانی کرنے کے بعد سلما نصر کی موت واقع ہوئی، اور اس کے بعد اُس کا لڑکا تقلتی نیناب اس کا جانشین ہوا۔ یہ بھی رعمسیس ثانی کا ہمعصر تھا، اور کوئی پچیس سال تک اُس نے اشوریہ

پر حکومت کی۔ وہ اپنے باپ سے کچھ کم طاقتور نہ تھا۔
میتانیوں و نیز سلما نصر کے دیگر مفتوحہ علاقوں سے
وہ برابر خراج سمیٹتا رہا، بابلستان پر متعدد مرتبہ
چڑھائیاں کیں، اور اس پر کوئی سات سال تک
حکمراں رہا۔ اس کے بعد اشوریہ اور بابلستان میں
بغاوتیں شروع ہوئیں۔ تقلتی ینناب خود اپنے امرا کے
ہاتھوں بے رحمی سے قتل ہوا، اور بابلستاں نے اپنی
آزادی حاصل کرلی۔

تقلتی نیناب کے قتل سے اشوریہ کا زوال شروع
ہوگیا، اور تقریباً نصف صدی تک پھر اس کو پنپنا
نصیب نہیں ہوا۔ لیکن اشوروان کے عہد میں اشوریہ
کے دن پھرے، اور اس فرمانروا کی سرکردگی میں
اشوریوں نے بابلستان پر چڑھائی کی، اور کئی ایک شہروں

کو لوٹ کر سارا مالِ غنیمت سمیٹ لے گئے۔ کچھ عرصے بعد عیلامیوں نے بابلستان پر حملے شروع کئے' اور بابلستان کا ایک مہلک ضرب لگائی جس سے قسطی قوت جانبر نہ ہوسکی۔ اس کے بعد بابلستان میں قسطی عملداری کا جو تقریباً چھ سو سال تک قائم رہی' بالکل خاتمہ ہوگیا اور بابلستان کی حکومت علیسان کے فرمانرواؤں کے ہاتھ آئی۔ یہ ذکر ہے اُس زمانے کا جبکہ مصر پر رعمسیس ثالث کی حکومت تھی۔

کچھ عرصے تک بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ علیسان کا فرمانروا گھرانہ اشوریہ کو بھی دبا کر خود اپنی حکومت قائم کرلے گا۔ چنانچہ اس گھرانے کے تیسرے تاجدار بخت نصر نے عیلامیوں' قسطیوں' عامریوں' اور حتیتیوں کو شکست دی اور اسی فتح کے گھمنڈ میں اُس نے

اشوریہ پر بھی حملہ کیا۔ لیکن اشوریہ کے دلیر بادشاہ اشور اَشیشی کے مقابلے میں اُسے ہزیمت اُٹھانی پڑی اور یہیں سے واقعات نے اشوریہ کی موافقت میں پلٹا کھایا۔

اشور اشیشی کے بعد اس کا لڑکا تِلگد پلاسر اُس کا جانشین ہوا جو بیسویں خانوادے کے آخری فرعون کا ہمعصر تھا۔ تِلگد کے عہد میں کوئی طاقت اشوریہ کی ہمسر نہ تھی۔ اُس نے حیتیوں کے زور کو توڑا، اور بابل کو فتح کرکے اپنی اشوری سلطنت قائم کی۔ لیکن تلگِد کی یہ قائم کردہ سلطنت صرف اس کے عہدِ حکومت یعنی تخمیناً تیرہ سال تک قائم رہ سکی، اس لئے کہ اس کے جانشین سب کے سب کمزور، اور فوجی قیادت کے نا اہل تھے۔

تِلگد پلاسر کے مرتے ہی بد نظمیوں کا دَور شروع
ہوا۔ یہ سیل و نہار دیکھ کر حجاز کے آرامی آوارہ گردوں
نے اشوری علاقوں پر اپنی بے ہنگام یورش سے
ابتری پھیلادی۔ اِن کے علاوہ ریگستانِ حجاز کے دوسرے
آوارہ گرد قبائل نے بھی غارتگرانہ حملے شروع کردئے،
اور بالآخر اُس علاقے پر جو کبھی بحری سلاطین کی
قلمرو کہلاتا تھا اور جس کا ہم نے سولھویں باب میں
ذکر کیا ہے، متصرف ہوکر اپنے فرمانرواؤں کا سلسلہ
قائم کیا۔ ان لوگوں نے بابلستان کو بھی فتح کیا، اور
کچھ عرصے تک اُس پر حکمرانی کرتے رہے۔ یہ سامی
آوارہ گرد، تاریخ میں کلدانی کہلاتے ہیں جن کا تفصیلی
حوال ہم آیندہ بیان کریں گے۔

بہرحال تلگد پلاسر کی موت سے دو سو سال

بعد اشوریہ نے پھر زور پکڑا، اور اپنی ایک سلطنت قائم کرلی۔ اشوریہ کی یہ دوسری سلطنت اُس کے بعض جنگجو بادشاہوں کی مساعی کے باعث معرضِ وجود میں آئی۔ ان میں اشور ناصرِ پل ثانی، سلما نصر ثالث شمس حدد خامس، اور حدد نراری ثالث خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔

اشوریوں کی پہلی سلطنت کے زمانے میں اُن کے فرمانروا محض فتوحات، مال غنیمت، اور سالانہ خراج پر قانع رہے اور مفتوحہ علاقوں کو دواماً اپنے تصرف میں رکھنے کی جانب کبھی توجہ نہیں کی۔ لیکن دوسری سلطنت کے زمانے میں ایک نیا طرزِ عمل اختیار کیا گیا۔ چنانچہ مفتوحہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے، یا کم از کم ان علاقوں پر مزید لشکر کشی کرنے کی غرض

سے، اشوریوں نے یہاں مستحکم قلعے بھی تعمیر کرنے شروع کیے۔

اشوریوں کی دوسری سلطنت جس میں شمالی شام، اور بابلستان شامل تھا، ایک صدی سے زائد عرصے تک قائم رہی۔ لیکن حدد نراری ثالث کے تین جانشینوں کے عہد میں اُس کا ادبار شروع ہو گیا۔ آرامیوں نے اس ابتری سے پھر فائدہ اُٹھایا اور اشوری سلطنت کے مغربی علاقے پر متصرف ہو گئے۔ کلدانیوں نے بھی اپنے ہم قبیلہ ساتھیوں کی تازہ بھرتی سے مطمئن، اور عیلامیوں کی کمک سے مضبوط ہو کر تمام بابلستان پر اپنا قبضہ جمایا۔

لیکن چالیس سال کے ادبار کے بعد اشوریہ نے حدد نراری ثالث کے چوتھے جانشین، تگلد پلا سر ثالث

کے عہد میں اپنی گم شدہ سطوت کو پھر حاصل کرنا شروع
کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے شاہنشاہانہ
اقتدار کی تیسری اور آخری منزل پر قدم رکھا جس کا تفصیلی
احوال ہم آیندہ باب میں بیان کریں گے۔

بابِ بیسواں

اشوریہ کا آخری عروج

تلگد پلاسر ثالث نے تقریباً اٹھارہ سال تک حکومت کی۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا، سلمانصر خامس اس کا جانشین ہوا۔ لیکن سلمانصر نے کُل پانچ سال تک حکومت کی جس کے بعد ایک غاصب نے اشوریہ کے تخت و تاج پر اپنا قبضہ جمایا اور سارگن ثانی کا لقب اختیار کر لیا۔

سارگن ثانی کے ظہور سے اشوریہ کی تاریخ کا زرّین دور شروع ہوتا ہے جبکہ اشوری طاقت کا دُنیا کی کوئی سلطنت مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔

اپنے عہدِ حکومت کے اوائل میں سارگن ثانی نے عبرانیوں کی شمالی قلمرو کے دارالحکومت (سمرون) پر چڑھائی کی، اور تقریباً ستائیس ہزار عبرانیوں کو سمرون اور اُس کے گرد و پیش کے تمام مقامات سے نکال کر میدیہ پہنچایا جہاں اُن آریاؤں کی نو آبادی تھی جو میدی کہلاتے تھے اور جو اشوریہ کے شمال مشرق جانب بہ حیثیت باجگزار رعایا کے آباد تھے۔ یہ ستائیس ہزار عبرانی، تاریخ میں اسرائیلیوں کے دس گم شدہ قبائل کے نام سے مشہور ہیں جن کا المناک انجام مورخین کی تلاش و تحقیق کے باوجود ابھی پردۂ خفا میں ہے۔

اپنے زمانۂ حکومت کے ساتویں سال میں سارگن نے شام کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی، یہاں

اس کے خلاف باغیانہ اتحاد اور ساز باز ہو رہا تھا۔ اُس
نے شام اور فلسطین پر لشکر کشی کی اور بالآخر ان
ممالک پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور شمالی حجاز کے فرمانروا
بھی اُس کے باجگزار بننے پر مجبور ہو گئے۔ چار سال بعد
یعنی اُس وقت جبکہ حبشی خانوادہ مصر میں برسرحکومت
آچکا تھا ایک اور سازش اُس کے خلاف ہوئی۔
چنانچہ حبشی فراعنہ جیسا کہ ہم نے اٹھارویں باب کے
آخر میں بیان کیا ہے، اِس دُھن میں لگے تھے کہ
عبرانیوں کی جنوبی قلمرو کے دارالحکومت (یروشلم) کی
مدد سے ایشیا میں اپنی سلطنت قائم کریں۔ لیکن سارگن
نے اس ریشہ دوانی کو کامیاب ہونے نہ دیا، بلکہ اس
کے علاوہ ایک تیسری سازش کا بھی قلع قمع کیا جو
شمالی شام اور ایشیائے کوچک میں اُس کے خلاف

بروئے کار لائی جا رہی تھی، اور ان ممالک کا بھی زور توڑ کر انھیں اپنا خراج گزار بنا لیا۔

اس کے بعد اس نے بابلستان کا رُخ کیا جہاں ایک کلدانی نے عیلامیوں کی مدد سے بابلستان کے تخت پر اپنا قبضہ جما لیا تھا، اور تقریباً گیارہ سال سے وہاں حکمراں بھی تھا۔ سارگن نے اس کلدانی فرمانروا کو شکست دی اور خود تمام بابلستان پر متصرف ہوگیا۔

سارگن نے کُل سترہ سال حکمرانی کی۔ اس کا انجام ہنوز پردہ خفا میں ہے، لیکن بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

سارگن کے بعد اس کا لڑکا سنخرب جو سلطنت کے شمالی حصے میں اس کی نیابت کرتا تھا، باپ کا جانشین ہوا۔ اس کے ساتھ ہی پھر ہنگامے برپا ہونے شروع ہوئے۔ جنوب میں کلدانیوں اور عیلامیوں نے دق کرنا شروع

کیا۔ یہ لوگ اپنے متفقہ ساز باز سے بابلستان کو دوبارہ فتح کرنے اور اشوریہ سے متصادم ہونے کے منصوبے گانٹھ رہے تھے۔ کلدانی سفیروں کا شمالی حجاز، فلسطین، اور فنیقی بلاد میں خیر مقدم ہونے لگا۔ لیکن سَنحُزب نے کلدانیوں اور عیلامیوں کو شکست دی، اور شام و فلسطین کو اپنی فوج سے پامال کرتا ہوا فنیقیوں کو بھی نیچا دکھایا۔ اُس نے کئی ایک عبرانی شہروں کو بھی فتح کیا، اور کوئی دو لاکھ عبرانیوں کو جلاوطن کر کے اپنی سلطنت کے ایک دُور اُفتادہ مقام پر منتقل کر دیا۔

کچھ زمانے بعد سَنحُزب نے پھر فلسطین کا رُخ کیا، اس لئے کہ مصر کی سازش کے باعث وہاں پھر ہنگامے برپا ہونے شروع ہوئے تھے۔ اس مرتبہ بھی اُس نے یروشلم کا حسب سابق محاصرہ کیا، لیکن فوجی کیمپ میں وبا پھوٹ پڑی اور سنحزب کو مجبوراً اپنے دارالسلطنت کی جانب لوٹنا پڑا۔

اِدھر بابلستان کے حالات نے پھر پریشان کر رکھا تھا، اِس لئے سَنحُرؔب نے شہرِ بابِل کا محاصرہ کیا، اور آخر کار اُس کو بالکل خراب و تاراج کر دیا۔ معبدوں اور محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس تباہ کاری کے سیلاب سے خانگی اَمکنہ بھی نہ بچ سکے، اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد جلا وطن کردی گئی۔ اُس نے اِسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ نہرِ فرات کے بہاؤ کا رُخ بھی کسی قدر بدل کر قرب و جوار کے تمام کھیتوں کو دَلدَل کا نمونہ بنا دیا۔

سنحرب، شہنشاہانہ حیثیت سے اپنی حکمرانی کے پچیس سال گزار چکا تھا کہ نینوا میں ایک بغاوت برپا ہوئی جس میں وہ خود اپنے دو لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لیکن دونوں قاتل حصولِ تخت کے مقصد میں ناکام رہے، اور سنحرب کا ایک اور لڑکا، اِیسَر حَدُّون اُس کا جانشین ہوا۔

اِسرحدون نے بابل کی تباہ شدہ حالت کو درست کیا، اور مفرور و جلا وطن باشندوں کو بابل میں دوبارہ آباد ہونے کی اجازت دی۔

اس کے بعد اُس نے اپنی سلطنت کے مغرب جانب توجہ کی جہاں فلسطین میں حبشی فراعنہ اشوری اقتدار کی راہ میں حسب سابق مزاحم ہو رہے تھے۔ اس لئے اپنے عہدِ حکومت کے ساتویں سال میں اسرحدون نے مصر پر دھاوا کیا۔ پہلے پہل تو اُسے پیچھے ہٹنا پڑا، لیکن اُس کا دوسرا حملہ نہایت کامیاب رہا۔ اس مرتبہ کوہِ سینا کے بدوؤں نے اُس کی بڑی مدد کی اور اُن کے شتربانوں نے اونٹوں پر پانی کی چھاگلیں لاد کر تمام اشوری لشکر کو سیراب کیا۔ مصری فوج بری طرح پسپا ہوئی، شہر ممفیس تاخت و تاراج کر دیا گیا، اور حبشی فرعون کو جنوبی مصر کی طرف مجبوراً ہٹنا پڑا۔

دوسرے سال فرعون نے پھر شمال کا رُخ کیا، اور اِسرحدون مصر کو دوبارہ فتح کرنے کے عزم سے لشکر سمیت کوچ بول چکا تھا کہ راستے میں اوس کی موت واقع ہوگئی۔

اس کے بعد اسرحدون کا بیٹا اشور بانی پل اُس کا جانشین ہوا جسے یونانی لوگ سرڈانوپَلَس کہتے تھے وہ اپنے باپ کا ہم آہنگ اور ہم خیال تھا۔ چنانچہ اُس نے مصر پر لشکر کشی کی، اور تقریباً تمام ملک کو فتح کر لیا۔

لیکن مصر پر دیر تک تصرف قائم رکھنا کچھ آسان بات نہ تھی۔ چنانچہ حبشی قیادت میں پھر بغاوت برپا ہوگئی۔ اشور بانی پل نے دوسری مرتبہ مصر پر حملہ کیا اور ممفیہ پر قبضہ کرتا ہوا جنوب کا رُخ کیا، اور تمام ٹھیبیہ کو تباہ و تاراج کر دیا۔ اس کے بعد شہر سائیس کے ایک سردار سامتیق

کو اشوریہ کے باج گزار کی حیثیت سے مصر کا فرعون مقرر کیا۔
اس طرح سامتیق نے چھبیسویں[۲۶] خانوادے کی بنیاد ڈالی،
جو مصر عتیق کے دیسی فرمانرواؤں کا آخری خانوادہ تھا۔

اپنی حکمرانی کے سولھویں سال میں اشور بانی پل کو
ایک زبردست سازش کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کے بھائی کی
کارستانیوں کا نتیجہ تھی، جو بابلستان کے تخت پر ایک باج گزار
بادشاہ کی حیثیت سے متمکن تھا۔ اس باغیانہ ساز باز میں
عیلامی، کلدانی، آرامی، اور شام و فلسطین کے چھوٹے چھوٹے
فرمانروا بھی شریک تھے۔ لیکن اپنے تمام حریفوں کا اس
نے یکے بعد دیگرے قلع قمع کر دیا۔ اسی اثنا میں سامتیق
نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا، اور اس طرح مصر
اشوریوں کے ہتھے سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

اشور بانی پل یا سرڈانو پلس ایک روشن خیال

اور شائستہ فرمانروا تھا جسے لشکرکشی اور ملک گیری کے مقابلے میں امن و سکون کی زندگی زیادہ مرغوب تھی۔ اُس کے چالیس سالہ عہد کے تمام سنگین معرکے اور فتوحات اُس کے سپہ سالاروں کی عرقریزانہ مساعی کا نتیجہ تھیں۔ وہ خود علم و فن کا قدر دان اور مربی تھا۔ اُس کے کتب خانے میں جس پر اُسے بجا طور پہ ناز تھا، تقریباً دس ہزار تحریری تختیاں موجود تھیں، جن میں بابلستانی کتب عالیہ کے تراجم بھی شامل تھے۔

اشور بانی پل کی حکمرانی کے آخری اٹھارہ سال میں اشوریہ کے اقتدار اور فوجی طاقت میں انحطاط شروع ہوگیا اور اُس کی موت کے ایک سال بعد شمالی بابلستان، نبو پلاسّر نامی ایک کلدانی فرمانروا کے ہاتھ میں آگیا جس نے بارہ سال کے عرصے میں اتنی طاقت پیدا کرلی کہ میدیوں،

ایک اشوری محل کا ہال
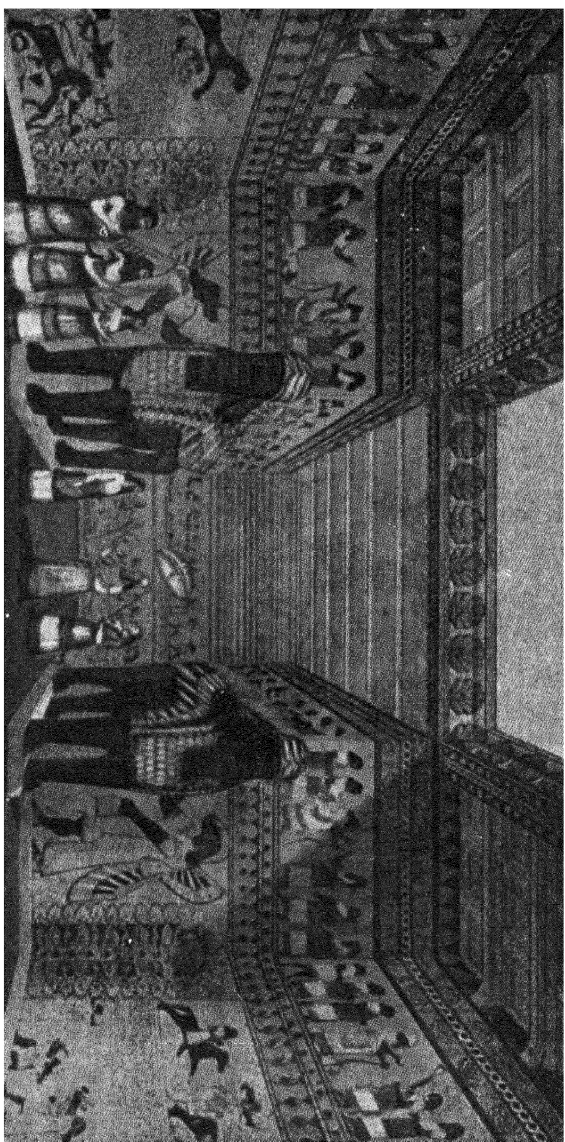
سیتھیوں، اور ایرانیوں کی معیت میں اس نے نینوا پر
دھاوا کیا، اور تمام شہر کو لوٹ مار کر مٹی کا ڈھیر بنا دیا جس
کے بعد نینوا کو پھر آباد ہونا نصیب نہیں ہوا۔
پھر نبو پلاسر اور شاہ میدیہ نے اشوری سلطنت کے
بیشتر حصے کو آپس میں تقسیم کر لیا، اور بابلستان کا تمام علاقہ
بنو پلاسر کے بخرے میں آیا۔ اشوری لشکر کے چند دستے
جو غنیم کی زد سے بھاگ نکلے تھے، اپنے ایک شہزادے کی
قیادت میں اشوری سلطنت کے مغربی حصے میں کچھ عرصے
تک پناہ گزیں رہے۔ یہیں سے ان لوگوں نے سامتیق
مصر کے لڑکے نکوہ ثانی کے ساتھ بابلیوں اور سیتھیوں کے
خلاف سازش کی

ضمناً یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ یہی نکوہ فرعون
تھا جس نے فنیقیوں کو افریقہ کے اطراف بحری مہم پہ بھیجا

تھا اور جن کے طویل بحری مخاطرے کا ہم نے بہ نظرِ سہولت بحر پیماؤں کے باب میں ذکر کیا ہے۔

بہر حال نینوا کی خرابی کے سات سال بعد واقعات نے نازک صورتِ حال اختیار کر لی۔ اور مصریوں اور اشوریوں نے اپنے بابلی غنیم کے خلاف قرقمش پر سنگین مقابلہ کیا۔ بابلی افواج کی کمان ایک کلدانی شہزادے، بخت نصر کے ہاتھ میں تھی جس نے اپنے حریفوں پر زبردست فتح پائی۔ بابلیوں کے گھیرے سے پریشان ہوکر، نکوہ فرعون نے فلسطین سے جنوب کا رُخ کیا۔ لیکن اپنے باپ کے مرنے کی خبر سنتے ہی بخت نصر نے تعاقب سے مُنہ موڑ کر بابل کی راہ لی، اور وارثِ تخت و تاج ہونے کے بعد بخت نصر ثانی کہلانے لگا۔

قرقمش پر بخت نصر ثانی نے ایسی کامل فتح پائی تھی کہ

اس کے بعد اشوریہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ مصر نے کلدانیوں سے صلح کر لی، اور اپنے قدیم حلیف یعنی عبرانیوں کی جنوبی قلمرو کو اس کی تقدیر پر یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔

چار سال بعد بخت نصر نے اس جنوبی قلمرو کے دارالحکومت یروشلم پر چڑھائی کی، اور کوئی دس ہزار اسیرانِ جنگ کو جن میں شہزادے، سپہ سالار، کاریگر وغیرہ شامل تھے، اپنے ساتھ لیتا گیا۔

چند سال بعد یروشلم کے بادشاہ نے بغاوت کی۔ بخت نصر نے دوسری مرتبہ اس پر لشکر کشی کی، اور بالآخر اٹھارہ مہینے کے محاصرے اور جنگ کے بعد یروشلم والوں نے فاقہ کشی سے عاجز آ کر اطاعت قبول کر لی۔ تمام شہر بکلی تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد جلا وطن کر دی گئی جس کے بعد عبرانیوں کی جنوبی قلمرو کا بھی وہی حشر ہوا

جو اس سے کوئی ڈیڑھ سو سال پیشتر اشوری سارگن ثانی کے عہد میں ان کی شمالی قلمرو کا ہوا تھا۔

عبرانیوں نے نوع انسانی کی روحانی اور اخلاقی ترقی کی تشکیل میں ایسا زبردست حصہ لیا ہے کہ قدیم تمدنوں کی یہ داستان اس مختصر جماعت کا احوال بیان کئے بغیر ادھوری سی رہ جائے گی، اس لئے ہم آئندہ باب میں اُن کی تاریخ اور خدمات کا ایک مختصر و مربوط خاکہ پیش کریں گے۔

باب اکیسواں

عبرانی اور اُن کی قلمرو

شام کے جنوب کا وہ خطہ جسے آج فلسطین کہتے ہیں
اور جس کا بہ نظر سہولت ہم نے گزشتہ ابواب میں اسی نام
سے ذکر کیا ہے، عہدِ حمرابی سے پہلے اور بعد میں بھی ایک
زمانے تک کنعان کے نام سے مشہور تھا، اور وہ لوگ جو
یہاں آباد تھے کنعانی کہلاتے تھے جو ابتدا عرب حجاز سے آئے
تھے، اور عامریوں اور فنیقیوں سے قریب کا رشتہ رکھتے تھے
اب سے کچھ اوپر چار ہزار سال قبل یعنی حمرابی کے عہد
حکومت میں سامی آوارہ گردوں کا ایک اور گروہ حجاز کے

شمال سے چکر لگاتا ہوا، اپنے قائد حضرت ابراہیم کی سرکردگی میں بہ جانبِ مغرب کنعان میں داخل ہوا۔ یہ آوارہ گرد عبرانی تھے جن میں سے بعض کنعان کے علاقے میں بس گئے، اور بعضوں نے بہ جانبِ جنوب مصر کا رُخ کیا جہاں اس وقت گیارہواں خانوادہ برسرِ اقتدار تھا۔

کچھ عرصے بعد بعض عبرانی حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب کے زمانے میں بھی مصر میں داخل ہوئے۔ حضرت یعقوب کو اسرائیل بھی کہتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ عبرانی باشندے اب بنی اسرائیل کہلانے لگے جنھیں فراعنۂ مصر نے صدیوں تک اپنی غلامی میں رکھا، یہاں تک کہ انیسویں خانوادے کے عہد میں اُن میں ایک زبردست قائد پیدا ہوا جس نے انھیں مصر سے نکال کر ملکِ کنعان کی جانب اُن کی رہنمائی کی۔

اسرائیلیوں کے اس پُرجوش قائد کا نام موسیٰ تھا جنھیں رعمیس ثانی کا ہمعصر بتایا جاتا ہے۔ خروجِ مصر کے بعد بھی حضرت موسیٰ نے اپنے جھنڈے تلے بہت سارے پیرو اکٹھا کیے، اور ان سب کو ایک نئے مذہب کے وسیلے متحد اور یک جہت کیا۔

موسیٰ سے پہلے عبرانی لوگ دوسرے قبائل کی طرح آثار پرستی کرتے تھے۔ ان آثار میں مقدس ترین چیز عہد کا صندوق تھا جس کی پرستش کا حضرت ابراہیم کے زمانے سے بہت پہلے تک پتہ چلتا ہے۔ یہ صندوقِ عہد ایک سیدھا سادہ صندوق تھا جو لکڑیوں کے چوکھٹے پر رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا جاتا، اور صحرا نوردیوں میں ہمیشہ قبیلے کے ہمراہ رہا کرتا تھا۔ جہاں کہیں بھی یہ لوگ زمین گیر ہوتے، یہ صندوق ایک علیحدہ خیمے

کے اندر خدام اور پاسبانوں کی تحویل میں رکھ دیا جاتا جن
کا یہ فریضہ ہوتا کہ اس مقدس یا مسکنِ ربانی کی حفاظت
کریں اور عبرانی خدا کا فرمان اس کے بندوں تک، اور
بندوں کی التجائیں اُن کے خدا تک پہنچایا کریں۔
لیکن موسیٰ نے سرے سے ایک نئے مذہب کی
تلقین شروع کی۔ حضرت ابراہیم کی طرح حضرت موسیٰ کا
بھی یہ ایقان تھا کہ خدا ایک ہے، اور وہ نظروں سے نہاں
لیکن تمام کائنات پر قادر ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس
عقیدے کی سرگرم تبلیغ کی اور اپنے پیروؤں سے کہا کہ اُ
کا خدا تنہا اسرائیلیوں ہی کا خدا نہیں بلکہ تمام کائنات کا پرو
ہے۔ جو اسرائیلیوں سے پہلے بھی موجود تھا، اور اُن کے
نیست و نابود ہو جانے کے بعد بھی موجود رہے گا۔ نیز
بنی اسرائیل اگر اِس خدا کے احکام کی تعمیل کریں گے ت

عبرانی مقدس
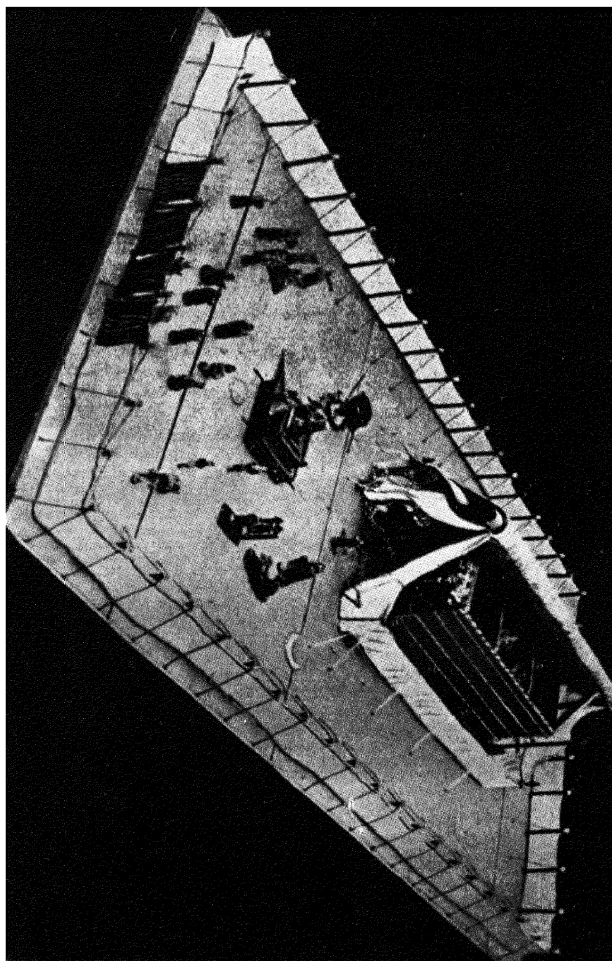
اُنھیں حکمرانی کے لئے نہ صرف ایک قلمرو ملے گی، بلکہ دوسری اقوام پر بھی اُن کا تسلط رہے گا۔

اِن عقائد اور توقعات سے سرگرم اور یک جہت ہوکر بنی اسرائیل مصر سے نکلے، اور ملکِ کنعان کا رُخ کیا جس کے متعلق اُن کا ایقان تھا کہ یہ وہی ارض موعود ہے جس کی صدیوں پیشتر ابراہیم اور اُس کے پیروؤں کو خدا نے بشارت دی تھی۔

مصر سے باہر دوسرے عبرانی بھی اُن میں آملے، اور بالآخر بارہ قبائل کا ایک جمِ غفیر بن گیا۔ لیکن چالیس سال تک یہ بارہ قبیلے ریگستان اور بیابان میں بے نیلِ مرام ٹکراتے رہے، اور اطراف کی پہاڑیوں کے سوا ارضِ موعود کا ایک چپّہ بھی اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ اِس زمانے میں ساحلی علاقہ فلسطیوں کے قبضے میں تھا، جن کا اِس سے پہلے ہم

ذکر کر چکے ہیں۔

غرضکہ پشتہا پشت تک یہ عبرانی گمنامی میں بسر کرتے، اور آس پاس کے قبائل سے ناکام لڑائیاں لڑتے رہے۔ اِس زمانے میں اُن کے قاضی اُن پر حکمراں تھے جو معرکہ آرائیوں میں اُن کی رہبری کرتے تھے۔ لیکن اشوریوں کی دوسری سلطنت کے ظہور سے کچھ ہی پہلے، اِن لوگوں نے اپنے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کیا جس کا نام ساؤل تھا۔ ساؤل نے لڑائیوں میں اُن کی سرکردگی کی، لیکن اس کی قیادت قاضیوں کی قیادت سے کچھ بہتر ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ فلسطیوں کے خلاف ایک معرکے میں اس کی فوج بری طرح پامال ہوئی، اور وہ خود بھی قتل کیا گیا۔

ساؤل کے بعد حضرت داؤد اُس کے جانشین ہوئے جو اپنے پیش رو سے زیادہ پُرکار اور کامراں تھے۔ انھوں نے

طیرہ کے ایک فینیقی بادشاہ سے اتحاد قائم کیا جو خود اُن کی
قوت کے استحکام اور عبرانی قلمرو کے قیام میں مدد
ثابت ہوا۔ داوُد فلسطیوں کو روکنے میں بھی کامیاب رہے۔
اُن کے عہد کا نہایت ممتاز واقعہ قلعۂ یروشلم کا انتخاب تھا
جو بعد کو اُن کی قلمرو کا دارالحکومت، اور عبرانیوں کی
قومی زندگی کا مرکز بنا۔

حضرت داوُد کے بعد حضرت سلیمان اپنے باپ کے
جانشین ہوئے، جنھوں نے طیرہ کے بادشاہ سے نہ صرف
دوستانہ تعلقات برقرار رکھے۔ بلکہ رشتۂ اتحاد کو اور بھی مستحکم
کیا۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ سلیمان کے عہد میں عبرانی قلمرو
کو وہ آسودہ حالی نصیب ہوئی جس کی عبرانی تاریخ میں
اس سے پہلے یا بعد کو کہیں نظیر نہیں ملتی۔

حضرت سلیمان نے اپنے واسطے ایک عالیشان محل

تعمیر کرایا، اور بڑے کرّوفر کے ساتھ زندگی بسر کرنی شروع کی۔ چنانچہ اُن کے جاہ و جلال سے مرعوب ہوکر اکیسویں خانوادے کے ایک فرعون نے اپنی بیٹی اُنھیں بیاہ دی۔

حضرت سلیمان کے عہد کا نہایت ممتاز واقعہ اُس معبد کی تعمیر ہے جو اُنھوں نے یروشلم میں تعمیر کرایا تھا۔ اس معبد میں اُنھوں نے عہد کے صندوق کو متمکن کیا جس کے باعث عبرانی عبادت گاہ ایک مقام پر مُرتکز ہوئی۔

لیکن سلیمان کے بعد سے عبرانیوں کی یک جہتی اور جاہ و جلال کا خاتمہ ہوگیا، اور سلیمان کے بیٹے رحبعام کی تخت نشینی کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں سلیمان کے اسراف اور چیرہ دستی کے عواقب و نتائج کے خلاف بغاوت کا زور ہوا، اور عبرانی قلمرو ٹوٹ کر دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ شمال کے دس قبیلوں نے رحبعام کی اطاعت سے منھ موڑ

کر، شمال میں اسرائیلی قلمرو قائم کرلی جس کا سمرون پائے تخت قرار دیا گیا۔ جنوب کے دو قبائل میں سے ایک قبیلہ جو یہوداہ کہلاتا تھا، سلیمان کے جانشینوں کا مطیع رہا۔ اور اس نے قلمرو یہودیہ قائم کی جس کا یروشلم ہی دارالحکومت رہا۔

غرضکہ سلیمان کی موت کے بعد عبرانیوں کی تاریخ باہمی کشاکش، بیرونی حملوں، مصالحتوں، سازشوں اور داخلی منافقات کا ایک الم ناک منظر پیش کرتی ہے۔

عبرانی تاریخ کے اس حصے کے چند اہم واقعات ہم گزشتہ ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اشوریہ کے سارگن ثانی نے کس طرح سمرون پر چڑھائی کی، اور کس طرح اسرائیلیوں کے دس قبائل کو میدیہ منتقل کر دیا جس کے بعد سے اسرائیلی قلمرو کا جو تقریباً ڈھائی صدیوں تک قائم رہ چکی تھی، ہمیشہ کے لئے قلع قمع

ہو گیا۔ لیکن قلمرو یہودیہ مضمحل حالت میں مزید ڈیڑھ صدی تک برقرار رہی۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سنحرب کے عہد میں یہودیہ پر بھی اشوریوں کا حملہ ہوا، اور اس نے دو لاکھ یہودیوں کو اپنی سلطنت کے ایک دور افتادہ مقام پر منتقل کیا۔ اس کے بعد پھر بخت نصر ثانی نے یروشلم کا محاصرہ کیا اور دس ہزار اسیرانِ جنگ کو جن میں شہزادے سپہ سالار، اور پیشہ ور شامل تھے، اپنے ہمراہ بابلستان لیتا گیا۔ چند سال بعد یروشلم کے باجگزار بادشاہ نے بغاوت پر کمر باندھی۔ بخت نصر نے اس پر دوبارہ لشکر کشی کی اور اٹھارہ مہینے کے محاصرے کے بعد یروشلم والوں نے فاقہ کشی سے عاجز آکر اطاعت قبول کی۔ تمام شہر بکلی تاخت و تاراج کردیا گیا۔ یہودیہ کے تاجدار، صدقیاہ کی آنکھیں نکال لی گئیں اور اس کو پا بہ زنجیر بابلستان

پہنچایا گیا جہاں تا دمِ حیات وہ اسیر رہا۔ اس کے علاوہ،
یہودیوں کی ایک کثیر تعداد جلا وطن کر دی گئی، اور
کچھ یہودی جو بخت نصر کی زد سے بچ نکلے تھے، دوسرے
ممالک مثلاً مصر اور یورپ کے مختلف اقطاع میں پناہ
گزیں ہوئے۔

تقریباً ستر یا اسّی سال تک یہودی بابلستان میں اسیر
رہے، یہاں تک کہ ایرانی فاتح، خورسِ اعظم (کیخسرو)
نے انھیں رہا کیا تاکہ وہ اپنے اُجڑے ہوئے شہر یروشلم
کو دوبارہ آباد کریں لیکن یہودی تاریخ کا یہ حصہ ہماری
کتاب کے موضوع سے خارج ہے، اس لئے کہ کلدانی
سلطنت کے زوال پر ہماری یہ داستانِ تمدن ختم ہوتی ہے۔
لیکن کلدانیوں کی ملتفت ہونے سے پہلے، دو اہم
امور کا تذکرہ ضروری ہوتا ہے۔

اولاً یہ کہ عبرانیوں نے تمدنِ عالم کی تعمیر میں نہ صرف

ایک نئے مذہب بلکہ ایک نئے قسم کے انسان، یعنی یہودی کا اضافہ کیا۔ دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے اپنی اسیری کے زمانے میں اپنی مقدس کتاب کا بیشتر مواد اکٹھا کیا، اور اس کو سپردِ قلم کرنا بھی شروع کیا۔

کتاب مقدس کے بعض واقعات مثلاً تخلیقِ کائنات، طوفانِ نوح، اور حضرت موسیٰ کی زندگی کے ابتدائی حالات وغیرہ و نیز سامرستانی روایات قصص میں جو بابلستان کی ادبیاتِ عالیہ میں داخل ہو چکے تھے، صاف و صریح طور پر مماثلت کا پہلو پایا جاتا ہے جس کے متعلق ہم گزشتہ اوراق میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ امر ذہن نشین کر دینا ضروری معلوم ہوتا، کہ ان ظاہری مماثلتوں اور خوشہ چینیوں کے باوجود عہد نامۂ قدیم کا بیشتر حصہ خالص عبرانی اور عبرانی قلب و دماغ کی پیداوار ہے، جو علاوہ دیگر امور کے عبرانیوں کی تاریخ، عبرانی رسوم، ان کے

نیت، حکیمانہ اقوال اور عبرانی رسولوں کی نبوتوں، الہامات اور احتجاجی صداؤں پر مشتمل ہے۔

عبرانی رسولوں کا وہ سلسلہ جس کی سلیمان کی موت کے دو سو سال بعد عاموس سے ابتدا ہوتی ہے، ایک خاص قسم کے انسانوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ عبرانی معاشرے کے مختلف طبقات سے ہوا کرتے تھے اور ان میں سے بعضوں کو کاہنی طبقے سے دور کی بھی نسبت نہ تھی۔ لیکن اس قسم کے تمام رسول چند مشترک اوصاف سے متصف تھے۔ یہ لوگ ایک خاص مذہبی جوش اور ولولے کے ساتھ اپنی قوم یا قبیلے کے سامنے نمودار ہوئے، اور ہمیشہ خود کو کاہنی آداب و رسوم اور معابد سے بے نیاز رکھا۔ وہ اپنے قبیلے سے براہ راست ہمکلام ہوتے تھے، اور اپنے اس طرزِ عمل کو القائے باطن پر مبنی تصور کرتے، اور خود کو احکامِ ربّانی کا حامل سمجھتے تھے۔

وہ بسا اوقات سیاسیات میں بھی حصہ لیتے تھے،
اور اپنے لوگوں کو مختلف اقوام یا حکومتوں سے اتحاد کرنے
کی مخالفت یا موافقت کرتے اور مصر، اشوریہ، یا بابلستان
کی سازشوں سے باخبر رہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ وہ،
کاہنی طبقے کی غفلت شعاری یا اپنے بادشاہوں، اُمرا،
اور دولت مندوں کی سیاہ کاریوں اور مظالم کے خلاف
کھُلے الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کرتے، اور بار بار متنبہ
کیا کرتے کہ یہ سارے مظالم و گناہ خدا کی نظروں میں قابلِ
نفریں ہیں اور ایک نہ ایک دن خداوند کا قہر ظالموں او
گناہگاروں پر ٹوٹ کر رہے گا۔ عہد نامۂ قدیم کا معتد بہ
حصہ انھیں نبیوں کے الہامات، احتجاجی صداؤں، اور
اوامر و نواہی سے مملو ہے۔

حقیقت میں یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ عبرانی
رسولوں کی آمد سے دُنیا میں ایک نئی قوت کا ظہور ہو

ہے۔ ایک ایسی قوت کا جسے جرأت اخلاق یا بیدارئی ضمیر کہیں۔ اِن رسولوں نے نوعِ انسان کو اوہام پرستی اور غلامانہ ارادت کیشیوں، رسم بندیوں، اور ظالمانہ قربانیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک رسول کا پیغام تو نبوت کے اوجِ کمال تک پہنچ کر اس دن کی بشارت دیتا ہے جبکہ تمام بنی نوع انسان ایک خدا کے سائے تلے، کامل اتحاد کے ساتھ امن و سکون کی زندگی بسر کریں گے

غرضکہ عہدنامۂ قدیم نہ صرف تاریخ، قوانین، اور ادب کا بے مثل ذخیرہ ہے بلکہ وہ ایک ایسا نایاب مجموعۂ اخلاق بھی ہے کہ جس نے عبرانیوں کو روحانی حیثیت سے اپنے ہمعصروں میں بدرجۂ اتم مفتخر و ممتاز بنایا۔ علاوہ ازیں، اسی صحیفۂ عظیم کی بدولت اِن لوگوں میں قومی یگانگت ا یک جہتی کا ایسا احساس پیدا ہوا جو آج تک بھی اُن میں قائم ہے، حالانکہ زمین کے کسی چپّے پر اُن کی سلطنت نہیں

اب ہم بخت نصر، اور کلدانی سلطنت کے باقی ماندہ حالات کی طرف متوجہ ہوں گے۔

باب بائیسواں

خاتمہ

بخت نصر ثانی کو فوجی تدبر کے علاوہ امور سیاست
ور عمارت گری سے بھی بے حد شغف تھا۔ بابل کی سلطنت
ریم کے جاہ و جلال کی بحالی میں اُس نے اَن تھک
وشش کی، اور اپنے مقصد میں ہر طرح کامیاب رہا۔ اُس
نے بابل میں نہ صرف ایک قلعہ نما قصر تعمیر کرایا جس کے
اداب مرغزاروں اور آویزاں باغات کا اکنافِ عالم
ں بڑا شہرہ تھا، بلکہ اُس نے بہتیرے غیر آباد شہروں اور
عابد کو ٹھیک ٹھاک کر کے با رونق بنا دیا۔ بوسیدہ نہروں

لی مرمت کرائی، اور کئی ایک نئی نہریں بھی بنوائیں۔ یہ
کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بخت نصر کے عہد میں بابل کو نئے
سر سے ایک غیر معمولی اہمیت اور اقبالمندی حاصل ہوگئی
جو مغربی ایشیا کے کسی شہر کو نصیب نہ تھی، اور جو متعدد
سیاسی انقلابات کے باوجود صدیوں تک برقرار رہی۔

تقریباً چالیس سال کی طویل اور کامران حکومت کے
بعد بخت نصر کی موت واقع ہوئی، اور اَوِیل مردک
اپنے باپ کا جانشین ہوا، لیکن مردک نے بہت جلد
کاہنوں سے عداوت مول لی اور چند ہی مہینوں کے اندر
قتل کر دیا گیا۔

پھر، بخت نصر کا داماد مردک کی جگہ تخت پر بٹھایا گیا
اُس نے چار سال تک سلطنت کی جس کے بعد اُس کا
ایک کم سن لڑکا اُس کا جانشین ہوا۔ لیکن نو ماہ کی حکمرانی

کے بعد کاہنوں نے اُسے بھی معزول کردیا، اور اپنی برادری میں سے ایک شخص کو تخت پر بٹھایا جس کا نام بنو نیدوس تھا۔

بنو نیدوس نے تقریباً سولہ سال تک حکمرانی کی، لیکن اُس کی تمامتر توجہ معابد کی درستی اور قدیم کتبوں کی دیکھ بھال اور مطالعے میں صرف ہوئی۔ سلطنت کے دفاع کی جانب اُس نے کوئی اعتنا نہ کیا، اور افواج کی کمان اپنے بیٹے بیلشفر کے تفویض کردی۔ بنو بیندوس بڑا علم دوست اور آثار قدیمہ کا شیدائی تھا۔

لیکن کلدانی سلطنت کو اس وقت ایک علم دوست بادشاہ کی بجائے ایک کارواں اور باتدبیر سپہ سالار کی ضرورت تھی، اس لئے کہ ایرانیوں میں ایک نیا فاتح اور فوجی قائد نمودار ہوچکا تھا جس کا نام خورس تھا، اور جو نہ صرف اپنے

میدی سرتاج پر غلبہ پاکر میدیوں اور ایرانیوں کا بادشاہ بن بیٹھا تھا، بلکہ لیدیہ کے قارون نامی ایک تاجدار کو شکست دے کر یہ علاقہ بھی اُس نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا جب خورس نے بابل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی، تو پہلے پہل اُسے اپنے مقصد میں ناکامی رہی۔ لیکن کچھ عرصے بعد اُس نے پھر لشکرکشی کی اور بابل کو یکلی اپنے قبضۂ تصرف میں لے لیا جس کے بعد کلدانی سلطنت کا جو کچھ اوپر ستر سال برقرار رہی تھی، ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

کلدانی سلطنت کی درہمی سے ایک دوسری نسل کا اقبال دُنیائے قدیم کے نظم و نسق پر کارفرما ہوا۔ اور عصائے شاہی اور اقتدارِ اعلیٰ سامیوں کے ہاتھ سے نکل کر آریاؤں کے ہاتھ میں آگیا۔ اِس زمانے سے تقریباً بارہ صدیوں تک سامی لوگ تاریکی اور گمنامی میں پڑے رہے یہاں تک کہ

سولِ عربی حضرت محمدؐ کی تعلیم و تلقین نے سامیوں
یں سرگرمی اور یک جہتی کی ایک نئی روح پھونک
ی جس کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں ان
وگوں نے اپنی نسل کی تاریخ میں دوسری مرتبہ کشور کشائی
ور جہاں بانی کی طرف فاتحانہ حیثیت سے قدم بڑھایا۔
یکن یہ موضوع ہماری اس کتاب کے حدود سے باہر
ہے۔ اور اب ہم حامی نسل کے ادبار کی جانب ملتفت
ہوں گے، جو خورس کے بیٹے اور جانشین کے ہاتھوں
مصر میں رو نما ہوا۔

ہم اس سے پیشتر بیسویں باب میں بیان کر چکے
ہیں کہ اشور بانی پل (سرڈانو پلیس) نے کن
حالات میں شہر سیئس کے سامتیق نامی ایک سردار
کو مصر کی بادشاہت سے سرفراز کیا تھا جس نے
چھبیسویں خانوادے کی ابتدا کی، جو مصرِ عتیق کے

دیسی فرمانرواؤں کا آخری خانوادہ تھا۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سامتیق نے مصری جاگیرداروں اور کاہنوں کے زور کو توڑ کر افواج کی از سرِ نو تنظیم کی اور مصر کو ایک طاقتور اور یک جہت قلمرو بنا دیا۔

اس چھبیسویں خانوادے کے عہد میں جو چھ فرمانرواؤں پر مشتمل تھا اور ایک سو تیس سال سے کچھ زائد عرصے تک حکمراں رہا، نہ صرف مصر کی فوجی قوت میں ترقی ہوئی بلکہ تمام ملک میں مختلف علوم و فنون کا بھی ایک شاندار احیاء ہوا۔ مصریوں کی رگِ حمیّت یکبارگی جوش میں آئی اور انھوں نے بے محابہ اپنے شاندار ماضی اور دیرینہ روایات کو تازہ کرنا شروع کیا۔ فن کار، مجسمہ ساز، کاہن، صناع، فراعنہ اور ان کے ندیم، غرضکہ مصری معاشرے کے تمام ذی اثر اور باکمال افراد قدیم اسالیبِ معاشرت اور اوضاعِ خیال کے احیاء

کی جانب ہمہ تن مصروف، اور اہلِ ملک کے دلوں
میں وطن دوستی اور قومی یگانگت کا احساس پیدا کرنے
میں سرگرمِ کار نظر آنے لگے۔

ہم بیسویں باب میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ سامتیق
نے کس طرح مصر کو اشوری حکومت کے جوئے سے
نجات دلائی، جبکہ اشور بانی پل اپنے ملک کی بغاوتوں
کے استیصال میں ہمہ تن مصروف تھا

سامتیق نے کچھ اوپر پچاس سال حکمرانی کی جس
کے بعد اُس کا لڑکا نکوہِ ثانی اُس کا جانشین ہوا جو
اپنے باپ کے نقشِ قدم پر گامزن رہا۔ اُس نے شام
و فلسطین میں قدیم مصری سلطنت کے دوبارہ قیام
کی جانب کوشش کی، جو اُس کے باپ کی انتہائی
آرزو تھی۔ لیکن اس مقصد کے حصول میں اُسے کامیابی

نہیں ہوئی۔

ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ کلدانیوں کے ہاتھوں اپنی سلطنت کی درہمی کے بعد، اشوریوں نے کس طرح نکوہ کے ساتھ رشتۂ اتحاد باندھا اور کس طرح اشوریہ اور مصر کے متفقہ لشکر کو بخت نصر کے مقابلے میں قراقمش پر ہزیمت اُٹھانی پڑی، جس کے بعد نکوہ بخت نصر کے تعاقب سے پریشان ہو کر مجبورا مصر کی جانب لوٹا اور اپنے قدیم حلیف یعنی قلمرو یہودیہ کو یکہ و تنہا چھوڑ کر کلدانیوں سے صلح کر لی۔

ہم اس موقع پر پھر یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہی نکوہ فرعون تھا کہ جس نے فنیقی ملاحوں کو افریقہ کے گرد بحری سفر اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ مصر کی بحری ترقی اور نئے بحری راستوں کی تلاش کا جذبہ

ناصبور جو نکوہ کے دل میں موجزن تھا، دُور و دراز ممالک میں مصری تہذیب کے نشر و اشاعت کا باعث ہوا۔

نکوہ کے جانشین، سامتیق ثانی نے کوئی پانچ سال حکمرانی کی جس کے بعد افریق اُس کا جانشین ہوا، جس کے بیس سالہ عہدِ حکومت میں مصر کی بحری قوت میں اور بھی ترقی ہوئی۔

افریق کے بعد آخمیس ثانی اُس کا جانشین ہوا جس نے چالیس سال کے طویل عرصۂ حکمرانی میں بڑی مقبولیت حاصل کی، اور بخت نصر اور اُس کے جانشینوں و نیز لیدیہ کے فرمانروا قارون کے ساتھ دوستانہ روابط برقرار رکھے۔

لیکن آخمیس کی حکومت کے آخری چند سال،

ایک نئی طاقت کے روز افزوں سیلاب کے باعث بے اطمینانی میں گزرے، جس کا ایک مختصر سا خاکہ ہم ابھی کچھ پہلے بیان کر چکے ہیں۔ آخمیس کی موت سے چودہ سال قبل، ایران کے خورس اعظم نے میدی اور کلدانی سلطنتوں و نیز لیدیہ کی قلمرو کو اپنے زیر نگیں کر لیا تھا، اور اس طرح مغربی ایشیا کے جملہ ممالک پر ایرانی لوگ عملاً قابض ہو چکے تھے۔

آخمیس ثانی کی موت کے بعد، اس کا لڑکا سامتیق اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ لیکن سامتیق ثالث نے چند ہی ماہ حکومت کی ہوگی کہ ایران کے اخسویرس نے جو اپنے باپ خورس اعظم کے مرنے کے بعد وارثِ تاج و تخت ہوا تھا، مصر پر چڑھائی کی اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

ایرانیوں کی یہ فتح حامیوں کے حق میں موت کا پیغام تھی، اس لئے کہ اس زمانے سے آج تک حامی لوگ کسی نہ کسی اجنبی نسل کے زیر اثر اور محکوم ہی رہے۔

ہندوستان کے دراوڑیوں کا بھی جن کا احوال ہم نے آٹھویں باب میں بیان کیا ہے، وہی حشر ہوا جو سامیوں اور حامیوں کا۔ تقریباً اس زمانے میں جبکہ حضرت موسیٰ اپنی اُمت یعنی اسرائیلیوں کو مصر سے ارض موعود کی طرف لانے میں سرگرم تھے، وسطِ ایشیا سے آریائی حملہ آوروں کے جوق شمال مغربی درّوں کی راہ ہندوستان میں داخل ہو رہے تھے۔

ہندوستان میں آریاؤں کی در آمد کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ پہلے پہل یہ لوگ پنجاب کے دراوڑیوں پر فتح یاب ہوئے، اور دراوڑی یا تو غلام بنے، یا ملک

کے مشرق اور جنوب جانب منتشر ہو گئے۔ پھر، یا تو مزید ملک گیری کے ذوق میں یا ایشیا سے نئی ٹولیوں کی درآمد کے باعث، اِن ہندی آریاؤں نے ہندوستان کے مشرقی اور جنوبی اقطاع کی جانب بڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایرانی سلطنت کی تاسیس کے زمانے تک تمام شمالی ہندوستان آریاؤں کے تصرف میں آ چکا تھا، جس کے بعد دراوڑی اقتدار کا دَور دَورہ ختم ہو گیا۔

دراوڑیوں، حامیوں، اور سامیوں کو اپنی قلمروؤں اور سلطنتوں کو کھوئے ہوئے، تقریباً ڈھائی ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ان کے عروج اور اقتدار کے رخصت ہونے سے بہت پہلے، دُنیا کے دُور و دراز اقطاع میں اُن کا تمدنی اثر پورے طور پر پھیل چکا تھا جس کی بدولت

پہنائے عالم کے طول و عرض میں نوعِ انسان
کے خیالات اور معلومات کا دائرہ دن بہ دن
وسیع ہونے لگا۔ اُن کے بعد مختلف نسلیں،
مختلف قومیں اُفقِ تاریخ پر نمودار ہوئیں، چمکیں،
اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ لیکن نوعِ
انسانی کے کارناموں کا وہ مائیہ ناز سلسلہ جس
کی ان لوگوں نے داغ بیل ڈالی تھی، فنا کی
دستبرد سے بے نیاز رہا۔ وقتاً فوقتاً بربریت،
جنگ و جدال، اور قتل و خوں کی گرم بازاریاں
بھی رہیں، لیکن بہ حیثیتِ مجموعی انسانی تمدن
کی داستان ہمارے سامنے ترقی و توسیع ہی کا

منظر پیش کرتی ہے، یہاں تک کہ اِس طویل داستان کا سلسلہ برابر ہمارے دَور تک پہنچتا ہے۔ کب، کیسے اور کہاں یہ سلسلہ منقطع ہوگا، اِس کا تعلق ذہن انسانی کے ماورٰی ہے۔